

شمس الاسلام

ماہنامہ

* بھیرہ (پاکستان) *

* * *

بابت ماہ جہادی الشاہی ۱۳۷۷ھ

مطابق ماہ جنوری ۱۹۵۸ء

مرتبہ مہدی میاح الدین کاکھیل

تحت ادارہ

غلام حسین } امیر حزب الامار بھیرہ
مدیر } مولانا الحاج انتھار احمد بکوی } سالانہ ہفتہ
(پاکستان)

بیگانہ زعمیت لا ناظرہ واصلی فی اللہ
 زید ہدایت

سالانہ چندہ
 عام سے ۳ روپیہ
 طلبہ سے ۲/۸ روپیہ

سالانہ چندہ
 معاونین سے ۵ روپیہ
 غیر محال سے ۴ روپیہ

مولانا افتخار احمد صاحب لکوی امیر حزب الانصار بھیرہ (پنجاب)
 معجانب

حزب الانصار بھیرہ

(اللہ کے دین کے مددگاروں کا گروہ)

اغراض و مقاصد (۱) اندرونی و بیرونی حلوں سے اسلام کا تحفظ و اشاعت اسلام۔

(۲) اصلاح رسوم و اتباع شریعت اسلامیہ، احیاء و اشاعت علوم دینیہ

طریق کار :- (۱) جریدہ شمس الاسلام کا اجراء (۲) دارالعلوم عزیزیہ جامع مسجد بھیرہ جو اپنے مختلف شعبوں کے ذریعہ اسلام کی بہترین خدمت سرانجام دے رہا ہے۔ (۳) مہنتین کے ذریعہ ملک کے طول و عرض میں اسلامی زندگی پیدا کی جا رہی ہے۔ (۴) عظیم الشان سالانہ کانفرنس (۵) امیر حزب الانصار کا مبلغین کے ہمراہ سالانہ تبلیغی دورہ (۶) کتب خانہ (۷) جامعہ مسجد بھیرہ کی حرمت

جریدہ کے قواعد و ضوابط :- (۱) شمس الاسلام ہر ماہ انگریزی کی پانچ تاریخ کو پابندی وقت سے شائع ہوتا ہے۔ مصنفین ہر ماہ کی دس تاریخ کو وصول ہونے چاہئیں۔ مدیر کا مضمون نگار صاحبان کی رائے سے متفق ہونا ضروری نہیں۔ (۲) ارکان حزب الانصار کے نام جریدہ مفت بھیجا جاتا ہے چندہ رکیت کم از کم ۴ ماہوار یا تین روپے سالانہ مقرر ہے۔ (۳) عام سالانہ چندہ ۳ روپے معاونین سے ۵ روپے طلبہ سے ۲/۸ روپے مقرر ہے۔ نمونہ کا پرچہ چار آنے کے ٹکٹ وصول ہونے پر بھیجا جاتا ہے۔ (۴) رسالہ باقاعدہ چارچ پڑتال کے بعد محالہ ڈاک کیا جاتا ہے۔ بعض رسائل راستہ میں تلف ہو جاتے ہیں۔ ایسی صورت میں خریدار کی طرف سے ہر ماہ کی ۲ تاریخ تک اطلاع موصول ہونے پر رسالہ دوبارہ بھیجا جاتا ہے۔ اطلاع ملنے کی صورتیں دفتر ذمہ دار نہ ہو گا۔ (۵) جو ایک نے جوابی کارڈ یا ٹکٹ آنے چاہئیں۔ (۶) ہندوستان والے اپنا چندہ حاجی فضل الہی علیہ السلام صاحبان کمیشن ایٹس آف نواب مسجد شریف ممبئی (ہندوستان) کو بذریعہ پی آر ڈر ارسال کریں۔ (۷) ہر رنگ ڈاک اور خطوط پر رنگ روانہ ہوں گے۔ جملہ خط و کتابت تفصیل ذیل بنام غلام حسین منیر شمس الاسلام بھیرہ (ضلع سرگودھا) ہونی چاہئے۔

سرخ نشان ○ دائرہ میں سرخ نشان سالانہ چندہ ختم ہونے کی علامت ہے۔ آئندہ ماہ کا رسالہ بذریعہ پی آر ڈر ارسال ہو گا جو کہ زائد اخراجات سے بچنے کے لئے بہتر صورت ہے۔ کہ آپ اپنا چندہ بذریعہ پی آر ڈر بھیجیں خریداری منظور نہ ہو تو اطلاع دیں۔ خدا راوی پی و پس کے ایک اسلامی ادارہ کو نقصان نہ پہنچائیں۔ خط و کتابت کرتے وقت خریداری نمبر کا ذکر ضروری ہے۔ غلام حسین منیر سالہ

مناہنامہ

مہینہ

مکتبہ: سید سیاح الدین کا کاغذ

جلد ۲۹	جمادی الثانی ۱۳۷۷ھ مطابق جنوری ۱۹۵۸ء	شمارہ ۱
فہرست مضامین		
نمبر	مضمون	صاحب مضمون
۱	قارئین شمس الاسلام کی قہجہ کے لئے	انتخارا احمد بکوی امیر حزب الانصار بھیرہ
۲	آفتاب شریعت و طریقت کا غروب	سید سیاح الدین کا کاغذ
۳	فقہ و تقویٰ کی کشمکش	مولانا محمد اسحق صاحب بندھیلوی۔ دارالعلوم ندوۃ العلماء۔ لکھنؤ
۴	انسانیت کی سب سے اہم ضرورت	مولانا سید ابوالحسن علی ندوی
۵	علم حدیث	مولانا اشفاق الرحمن صاحب کانڈھوی
<p>ہاتھام غلام حسین ایڈیٹر پرنٹر پبلشر شنائی بدقی پریس سرگرمی چپ کوڈرناڈ شمس</p> <p>جامع مسجد بھیرہ سے شائع ہوا</p>		

قارئین شمس الاسلام کی توجہ کیلئے

اسے ضرور پڑھئے!

محترم قارئین کرام!

آپ حضرات یقیناً اس حقیقت کو خوب اچھی طرح جانتے اور مانتے ہیں کہ گذشتہ ۷۸ برس کے عرصہ میں رسالہ شمس الاسلام نے دینِ مبین کی خدمات بہ حسن و جود سرانجام دی ہیں۔ اور اس نے ہزاروں مسلمانوں کی ذہنی تربیت کر کے ان کو صحیح عقیدہ پر چلا دیا اور ثباتِ قدم رکھا ہے۔ نیز مزائیت، ارفض و تشیع اور دوسرے فتنوں کے استیصال اور مسلمانوں کو ان کے مضمرات سے بچانے کے لئے ٹھوس اور مؤثر مضامین و مقالات پیش کئے ہیں۔ آپ حضرات کو خود اس کا بھی اندازہ ہے کہ کتابت، کاغذ اور طباعت کی پوسٹس رُبا گرانی کے اس دور میں تین روپیہ سالانہ معمولی چندہ پر ہر ماہ باقاعدگی کے ساتھ رسالہ آپ کی خدمت میں پیش کرنا کس قدر مشکل کام ہے لیکن چونکہ روزِ اول سے بانی حزب الانصار حضرت مولانا ظہور احمد صاحب بگوی رحمۃ اللہ علیہ کا مقصد حزب الانصار کے دوسرے شعبوں کی طرح اس ماہنامہ کے اجراء سے محض یہ تھا کہ اس ذریعہ سے بھی دین کی تبلیغ و اشاعت کا کام باقاعدہ جاری رہے۔ تجارت اور جلبِ منفعت پیشِ نظر نہ تھا۔ اس لئے ہم نے یہ قصد کر رکھا تھا کہ خواہ ہر مہینہ کچھ خسارہ ہو اور اصل اخراجات بھی پورے نہ ہوں لیکن چندہ سالانہ میں اضافہ کریں گے اور نہ رسالہ بند کریں گے۔ اور اللہ تعالیٰ کے فضل و کرم سے ہم اب تک نامساعد حالات کے باوجود اپنے اس عہد پر قائم رہے ہیں۔ چنانچہ آپ دیکھتے ہیں کہ ایسے زمانہ میں جبکہ گرانی انتہا کو پہنچی ہوئی ہے۔ اور بہت سے رسائل و اخبارات جاری ہو کر بند بھی ہو چکے ہیں۔ ہم نے "شمس الاسلام" کی اشاعت و قوت کی پوری پابندی کے ساتھ جاری رکھی ہے۔ مگر ظاہر ہے کہ یہ خسارہ ہم اپنی جیب سے تو پورا نہیں کر سکتے۔ یہ سالانہ مسلمانوں کی بھلائی اور ان کو دینی فائدہ پہنچانے کے لئے ہے۔ اس لئے اگر ہم اپنے مسلمان بھائیوں سے اس سلسلہ میں امداد و اعانت کی اپیل کریں تو یہ بھی ہمارا حق ہے لیکن ہم مناسب یہ سمجھتے ہیں کہ اس خسارہ کو پورا کرنے کے لئے کسی امدادی فنڈ کھولنے اور آپ سے امدادی عطیات کی درخواست کرنے کی بجائے ہم ایک دوسری صورت اختیار کریں۔ اور وہ یہ ہے کہ آپ رسالہ کی توسیع و اشاعت اور نئے خریدار ہتیا کرنے میں ہمارے ساتھ بہ دل و جان تعاون فرمائیں۔ اگر خریدار ان شمس الاسلام سے ہر خریدار پوری توجہ سے کام لے کر پانچ نئے خریدار پیدا کرے اور ہر خریدار سے سال بھر کا صرف تین روپیہ چندہ لے کر دفتر میں ارسال کرے تو یہ ایک بہت بڑا کارِ خیر اور جب اجرو ثواب ہو گا۔ اس طرح ایک تو دین کی دعوت اور زیادہ وسیع حلقہ تک پہنچ سکے گی۔ اور یہی اصل مقصد ہے۔ اور دوسرا فائدہ یہ ہو گا کہ ہمارا مالی بوجھ کچھ ہلکا ہو جائے گا۔ اگر اس سلسلہ میں ہماری پوری حوصلہ افزائی کی گئی۔ تو ہم رسالہ کی تکمات میں اور بھی اضافہ کریں گے۔ میں امید کرتا ہوں کہ ہمدردانِ شمس الاسلام ہماری اس درخواست کو ضرور قبول فرمائیں گے اور نئے خریدار جلد از جلد ہتیا کر کے دفتر میں اطلاع دیں گے۔ فقط والسلام خیر ختام۔

عاجز افتخار احمد بگوی کان اللہ (امیر حزب الانصار بھیرہ)

آفتاب شریعت و طریقت کا غروب!

شیخ الاسلام مرشد اعظم مجاہد کمال حضرت مولانا سید حسین احمد مدنی جو اہل حق تبار ہیں!

إِنَّا لِلّٰهِ وَإِنَّا إِلَيْهِ رَاجِعُونَ

سداوت گشتہ اند مصیبت نشین ہند	شد تمام حسین کنوت زہ دجہان
وزخون گریہ سرخ شد است آستین ہند	نیلی است زمین محالہ پیرا بن عرب
خاموش شد چراغ نشا طافین ہند	گیتی چرا سیاہ نہ گرد زرد و غم
دیدیم داستان شہر و سین ہند	ہندیاں جنین مصیبت عظمیٰ نہ دیدہ است
ایں است نو بہار گل آتشین ہند	از داغ دل زرد چرخ افغان اشک جوش
از شیدوں عظیم امیر ہمسین ہند	ہای در آب می طپد و مرغ در ہوا
یعنی کہ بود او نفس واپسین ہند	ہند از وفات او تن بے روح گشتہ است

۵ دسمبر روزِ بخشنہ کو قبل از نماز عشاء جامع مسجد (لالہ پور) میں ایک تبلیغی اجتماع تھا۔ اور حضرت مولانا محمد منظور صاحب نعمانی مدیر "المفرقان" لکھنؤ نے مسلمانوں سے خطاب فرمایا۔ عشاء کی نماز سے فارغ ہونے کے بعد قریباً پونے آٹھ بجے مقامی روزنامہ عوام کے دفتر سے ایک رپورٹر نے اکرا اطلاع دی کہ ابھی ابھی انڈیا ریڈیو سے یہ خبر نشر کی گئی ہے۔ کہ آج سہ پہر کو

حضرت مولانا حسین احمد مدنی کا انتقال ہوا

حیاتِ مستعار کا کیا اعتبار کسی کی رحلت کا حادثہ غیر متوقع تو نہیں ہوتا۔ اور پھر حضرت شیخ مدنی کی عرصہ دہائی کی علالت، پیرائہ سالی اور ضعفِ نقاہت کے ہوتے ہوئے تو اور بھی نظر بہ ظاہر غیر متوقع خبر تھی۔ مگر ہوا یہ کہ خبر سننے کے بعد قلب نے قبول کرنے سے بار بار انکار کیا۔ اور مکندہ یب کے لئے اس کی مختلف توجہیں کرنے لگا۔ شاید کہ ان سے سستے اور کچھ میں غلطی ہوئی ہوگی۔ کسی اور سلسلہ میں حضرت کا نام آیا ہوگا۔ انہوں نے کچھ اور سمجھا ہوگا۔ وہی بات کہ

فزعیت فیہ بآمالی الی الکذب

طوی الجذیرۃ حتی جامع فی خبر

مگر اُس شخص نے بڑے وثوق کے ساتھ کہا کہ خواہ آپ کی سمجھ میں آئے یا نہ آئے۔ اور آپ کا دل گوارا کرے یا نہ کرے بہر حال یہ حادثہ پیش آگیا ہے۔ ادیس میں یہی سمجھ کر ادریہ یقین حاصل کر کے آپ کے پاس آیا ہوں اور میرا مقصد یہ ہے کہ آپ مجھے حضرت مدنی کے مختصر سے حالاتِ زندگی مرتب کر کے ابھی دیدیں۔ تاکہ اس خبر کے ساتھ ہی ہم اخبار میں شائع کریں۔ اتنے میں پاکستان ریڈیو سنسنے والوں نے اگر بھی اس کی تصدیق کی۔ اور قلب جس واقعہ کو تسلیم کرنے کے لئے کسی طرح آمادہ نہ ہو گا تھا۔ آخر کار اُسے ملنے بغیر اس کو چارہ نہ رہا۔

حَتَّىٰ إِذَا الْمِيْدَعُ لِي صَدَقَهُ أَصْلًا شَرَقَتْ بِاللَّحْمِ حَتَّىٰ كَادَ يَشْرِقُ بَنِي
میڈیو کی برقی لہروں کے ذریعہ آئی ہوئی اس غم انگیز اور روح فرسا خبر نے بس اُسی وقت دلِ دماغ، حواس و جذبات اور سکونِ اطمینان کے غروب پر ایک برقی سونامی گرا دی۔ اسی نے سب کچھ محسوس کر دیا۔ اُس وقت زمین پاؤں تلے نکلنے لگی۔ اور آنکھوں کے سامنے اندھیرا چھا گیا۔ کان بجنے لگے۔ اور آنسوؤں کی ٹٹیاں رخساروں پر بہنے لگیں۔

لَمَّا لَغِيَ النَّاسُ بُرِيدَ الْغَوْلِ مِنْ الْأَرْضِ وَاسْتَكْتِ إِلَى الْمَسَامِعِ
وَاقْبَلْ مَا عَالَمِينَ مِنْ كُلِّ نَفْسٍ إِذَا صَدَرَتْ لَمْ تَسْتَطِعْهَا الْأَصْنَافُ
وَوَلَّتْ بَنِي الْأَرْضِ الْفَضَاءَ كَمَا تَهْجَا تَصْعَدُ بَنِي السَّمَاءِ وَتَجُولُ
وَلَمَّا لَغِيَ النَّاسُ بُرِيدَ الْغَوْلِ بَنِي الْأَرْضِ فَهَرَبَ الْحَزَنُ وَانْقَطَعَ الظُّهُ
عَسَاكَ تَغْشَى الْمَنَافِسَ حَتَّىٰ كَأَنَّ أَخْوَكَ دَارَتْ بِهَا مَتَهُ الْخُمْرُ
اس سانچہ ہوش و ہوا کی وحشت انگیز خبر سننے ہی تمام مجمع حواس باختہ ہو گیا۔ لوگ پھوٹ پھوٹ کر رونے لگے۔ اور چہنیں مار مار کر اور بے قابو ہو کر آنسو بہانے لگے۔ بعض اس رنج و غم کے پہاڑ گرنے سے بے خود ہو کر ہوش ہو گئے۔ اور مرغِ بسمل کی طرح ترپنے لگے۔ اور پوری کی پوری محفل پر کرب بے چینی اور پریشانی کی ایک خاص کیفیت چھا گئی۔

لَمَّا اتَى خَبَرُ الزَّبِيرِ تَقَشَّعَتْ سُورُ الْمَدِينَةِ وَالْجِبَالُ الْخُشَّعُ
یوں تو کہا جاسکتا ہے کہ اس دنیا میں ہر آنے والا ایک نہ ایک دن جانے ہی کے لئے آتا ہے۔ اس لئے دنیا میں مسافروں کی آمد و رفت کا سلسلہ جاری ہے اور تاقیامت جاری رہے گا۔ وَمَا جَعَلْنَا بَشَرًا مِنْ قَبْلِكَ الْخَلْدَ وَلَا يَكِلُ النَّفْسَ ذَاتِقَاتِ الْمَوْتِ اور کل شئی حالانکہ الٰہِ جہے کا قانونِ خداوندی ہر لمحہ اس دنیا میں نافذ اور جاری ہے۔ اور اب سے پہلے انبیاء و اولیاء و صلحاء و علماء سب کے ساتھ یہ معاملہ پیش آیا ہے۔ اس لئے زمین پر عمرِ جاودانی اور زندگیِ غیر فانی کسی کو نہیں دی گئی۔ مگر یہ بھی حقیقت ہے کہ تمام انسانوں کی موت بھی ایک برابر نہیں۔ کسی کی جہادئی اپنے عزیز و اقارب، اور خاندان کے لئے موجب رنج و اذیت پریشانی ہوتی ہے۔ اور کسی کی مفارقت ایک قبیلہ، ایک خاص گروہ یا قوم و دیوبادی کے لئے مدمم اور موجب اضطراب ہوتی ہے۔ لیکن ان دونوں ہی میں سے بعض مسکنات ایسی ہوتی ہیں کہ جب وہ اس عالمِ ناسوت سے عالمِ لاہوت کی طرف رختِ سفر باندھ کر چلتی ہیں اور اس مشاہیرہ "پر رگنہ" لئے عالمِ جاودانی ہوتی ہیں۔ تو وہ خود اگرچہ اس دارِ ابتلا و محن سے دانا و انعم کی طرف خندان خندان جاتی ہیں لیکن اُن کی اس دائمی مفارقت سے لاکھوں اور کروڑوں کی آنکھیں گریہ کن ہوتی ہیں۔ اور پوری قوم

کیا بلکہ قوموں کی دنیا اجر جاتی ہے۔ اور ہماری مجلسوں کی آن میں کوئی بوجہ جاتی ہیں چاروں ایک حکم میں ایک انداز پر چاہتا ہے۔ اور سچائی میں
ہندوں کی تعدادیں لوگ فرط غم سے مدہوش ہو کر مر رہے ہیں۔

حضرت شیخ الاسلام کی رحلت کا یہ حادثہ بھی عام انسانوں کی رحلت کے حادثہ کی طرح نہیں۔ ہمارے زمانہ سے پہلے جو اکابر و اساطین
امت دنیا سے تشریف لے گئے ہیں ان کے بارے میں اب ہم اپنے تاثرات کیا بیان کر سکتے ہیں۔ لیکن خود ہماری آنکھوں کے سامنے اس مجاہد و دلاور کے
نقشبہ روز کا علمبرکرام اور رہنمایان قوم نے اس سرے کافی سے عالم باقی کی طرف انتقال فرمایا۔ اور ان کی جدائی اور ان کے فوجوں و برکات سے
عروجی کا رخ و غم ہم نے عموماً کیا اور یہیم صدات سے قلوب زخمی ہوتے گئے۔ مگر جب حضرت شیخ مدنی موجود تھے۔ تو دلوں کو ایک ڈھاس مٹی تھی۔ کہ
رشد و ہدایت کا ایک چراغ نور و روشن ہے۔ اور ایک ایسی مٹی مرکز علوم و دینیہ دارالعلوم دیوبند کی منہ صدرات پر جلوہ افروز ہے۔ جو امت کے
فے عقیدت کی تکیہ گاہ اور اس دورِ ظلمات میں اُمید کی کرن کا حکم رکھتی ہے۔ لیکن آج ہماری بدقسمتی سے امت کی یہ متاع گراں پایہ بھی امت کے ہاتھوں
سے ملا اعلیٰ میں چلی گئی۔ اور ہم ان کے سایہ عاطفت سے ہمیشہ کے لئے محروم ہو گئے۔

عربی زبان کا ایک مشہور و معروف اور بقتل شہر ہے لیکن کلام موزون میں اس سے بڑھ کر مناسب موزون کلام حافظہ میں فی الحال مستحضر نہیں
جو حقیقت حال کی پوری تعبیر کر سکے۔ اس لئے دُوبی دہرا پڑتا ہے۔ کہ

فما کان قیس ھلکۃ ھلکۃ واحد
ولکۃ بنیان قوم ھتھماً

قیس بن عامر کے بارے میں شاید کہ شاعر نے مبالغہ سے کام لیا ہو گا لیکن حضرت شیخ مدنی کے بارے میں یہ مبالغہ مرگ نہیں۔ بلکہ واقعہ
کی صحیح تعبیر ہے۔ اور قوم سے مراد بھی صرف علماء کی جماعت نہیں، صرف مریدین و مترشدین کا گروہ نہیں صرف دیوبندی مسلک والے مسلمان
نہیں صرف ہندوستان کے رہنے والے مسلمان نہیں بلکہ درحقیقت دنیا سے اسلام کی پوری مسلمان قوم مراد ہے۔ ادنیٰ بالکل درست ہے کہ اس
سائنس عظمیٰ سے پوری مسلمان قوم کی بنیادیں متزلزل ہو گئی ہیں۔ اور مسلم قوم کا قصر رفیع گر کر پوند زین ہونے لگا ہے۔ حضرت مولانا سید ہادی
مذللہ نے بالکل صحیح فرمایا ہے۔

”ایک ایسی جامع صفات، مقدس انوار و برکات کی حامل شخصیت کا ہم سے رخصت ہو جانا شاید اس صدی کا سب سے
بڑا سانحہ اور ناقابلِ تلافی نقصان ہے۔ کسی ایک انسان کی موت سے اس کتنے یتیم، اس کی بوی بیوہ، اور اس کے عزیز
غمزوہ ہوتے ہیں۔ مگر آج وہ عظیم شخصیت ہم سے جدا ہوئی ہے۔ کہ کوئی ایک گھرانا، ایک گنبد اور خاندان نہیں پورا عالم
اسلام و انسانیت یتیم و بے سہارا ہو کر رہ گیا۔“

شیخ الاسلام حضرت مولانا سید حسین احمد مدنی قدس اللہ سرہ العزیز محض اس دور کے جید اور متبحر عالم دین اور امرا و شہریت کے
ماہر، اور مندرِ رشد و ہدایت کے صدر نشین مرشد و ہادی نہ تھے بلکہ وہ حقیقی ممنون میں سلف صالحین کی یادگار تھے۔ ”یہ چہ سراغ محمد“ محض دوشین کا
چراغِ سحر تھا۔ جو قریباً ۱۸ سال جل کر اور اس تیرہ و تار عالم کو روشن رکھ کر بالآخر ۱۲ جمادی الاولیٰ ۱۳۸۷ھ مطابق ۵ دسمبر ۱۹۶۷ء
کو ہمیشہ کے لئے بجھ گیا۔ حضرت حاجی امداد اللہ صاحب مہاجر مکی رحمۃ اللہ علیہ، قطب الارشاد حضرت مولانا رشید احمد صاحب گنگوہی رحمۃ اللہ

علیہ اور حضرت شیخ الہند مولانا محمد الحسن دیوبندی رحمۃ اللہ علیہ اور دوسرے اکابر اساتذہ کے علوم و معارف کے خزانوں کے آپ ہی اس موجودہ عصر میں امن تھے۔ اور آپ ہی کی ذات میں حضرات چشتیہ اور حضرت مجدد الف ثانیؒ اور حضرت سید احمد شہید بریلویؒ کی نسبتیں یکجا تھیں۔ آپ کا سیدہ چشتی ذوق و شوق اور مجددی سکون و محبت کا مجمع البحرین تھا۔ اور آپ کی زبان شریعت و طریقت کی وحدت کی ترجمانی تھی آپ کے فیض نے تقریباً نصف صدی تک اللہ تعالیٰ کے فضل و توفیق سے اپنی تعلیم و تربیت اور تزکیہ و ہدایت سے ایک عالم کو متقید بنا رکھا تھا۔ اور صرف ہندوستان میں نہیں بلکہ تمام دنیا سے اسلام میں اسلامی تعلیمات کی روشنی ان کی زبان فیض ترجمان اور تعلیم و تدریس کے واسطے سے پھیلی۔ دارالعلوم دیوبند کے دارالحدیث میں بیٹھ کر اس آفتاب علم و عرفان نے علوم و معارف حدیث رسول اللہ کی روشنی مشرق و مغرب تک پھیلا دی۔ اور اس بحر رشد و ہدایت نے اپنے فیض عظیم سے ہر خاص و عام لہر قریب بعید کو سیراب و شاداب کر دیا۔

كالشمس في كبد السماء وضوءه
يغشي البلاد مشارقاً ومغارباً

کالبحر یقذف للقریب جماء
جوداً ویبعث للبعید سحاباً

اور اس لئے زبانِ حق نے اُسے شیخ الاسلام کہہ کر پکارا۔ اور حقیقت یہ ہے کہ اس شیخ وقت کے لئے یہ خطاب حقیقت تھا۔ ایسے جامع الصفات اور پھر ہر وصف و کمال میں درجہ کمال پر فائز بزرگ بڑی مشکل سے کہیں عالم وجود میں آتے ہیں۔ علم و فضل کے انتہائی بلند مدارج پر فائز ہونے کے ساتھ ساتھ اسی درجہ میں عمل کے میدان کا شہسوار بہت ہی کم ملتا ہے۔ لیکن یہاں حالت یہ تھی کہ علمی کمالات و فضائل کے اعتبار سے اپنے دور میں عظیم النظیر اور فقیہ المثل ہونے کے ساتھ ہی عمل میں بھی یکتا اور سداً پامل ہی عمل تھے۔ شفقت و رحمت، علم و تواضع، ایثار و قربانی، عفو و کرم، جود و سخا، خدمت و مدارات، ہمان نوازی اور عند باد پروری اور اس قسم کے دوسرے نکات اخلاق کا وسیع و تمام شنا جاتا ہے لیکن واقعہ یہ ہے کہ ان فضائل اور محاسن اخلاق کو اگر عملی صورت میں کوئی دیکھنا چاہتا۔ تو اس کی یہی شکل تھی کہ حضرت مدنیؒ کی ملاقات سے بہرہ ور ہو کر انہی کمالات کا اپنی آنکھوں سے مشاہدہ کر کے یقین حاصل کرتا۔ اس لئے آج پاکستان و ہندوستان کے گوشہ گوشہ میں، ہر شہر اور ہر قصبہ میں، ہر مدرسہ اور ہر کالج میں، ہر مسجد اور ہر خانقاہ میں، ہر دینی اور ہر سیاسی جماعت کے دفتر میں صرف ایک عالم کی وفات کے صدمہ پر رونا نہیں بلکہ آج علم و عمل، شفقت و رحمت، شجاعت و جرات، جود و سخاوت، علم و عفو، ایثار و قربانی، تواضع و فروتنی، خدمت گزاری و انکاری، ہمان نوازی و مسافر پروری اور اسی طرح کے دوسرے اخلاق فاضلہ کی ایک نمایاں اور شہرہ آفاق مثالی ہستی کی مفارقت کا صدمہ ہر کسی کو خوں کے آنسوؤں لارہا ہے۔

لوگوں کو یاد آتا ہے کہ اس مجاہدِ عظیم نے ہندوستان کی آزادی اور انگریزوں کے پنجہ جوہر و استبداد سے ملک و قوم کو چھڑانے کے لئے کس قدر عظیم کارنامے انجام دیئے ہیں۔ اور مالٹا کی اسارت، کراچی کی عدالت میں مجاہدانہ ثمرہ حق اور پھر قید و بند کی صعوبت، پھر اس کے بعد استخلاص وطن کی خاطر بار بار جیل میں سفتِ بوسنی کو تازہ کرنا۔ اور مسلسل اس میدان میں مصروف جہاد رہنا۔ اور تقسیم ملک کے بعد ہندوستان کے خوفزدہ اور اکھر مچانے والے مسلمانوں کو جانے کے لئے شب و روز کی آنٹھک کوشش اور محاط و مہالک میں بہادرانہ گھس جانا یہ سب باتیں جب یاد آتی ہیں تو اس کے ساتھ اس پیکرِ عزم و استقلال کی عظیم شخصیت سامنے آتی ہے۔ اور پھر اپنی شخصیت کی دائمی جدائی کا

احساس ہوتا ہے۔ تو دل بے قابو ہو کر روڑے لگتے ہیں اور قلبی اضطراب کی لہریں اٹھ اٹھ کر آنکھوں سے بچ دھم کے آنسو بہا دیتی ہیں۔ جاننے والے جانتے ہیں کہ دنیائے اسلام کا یہ مخدوم اپنے مہمانوں کے پاؤں دبانے کے لئے رات کی خاموشیوں میں بیدار رہتا تھا۔ اندھا کوئی اپنا آٹا یا بیگانہ اس کا دسترخوان جو دو کرم ہمیشہ ہر کسی کے لئے فراخ و کشادہ رہا۔ اور پھر ایسا درویش غنی دل تھا کہ اس بدل و کرم اور جو دو سخا میں بھی عجز و انکسار کا انداز نمایاں تھا۔ آپ کا دن تو علوم و معارف کی خدمت و اشاعت سے روشن تھا۔ اور راتیں ذکر و خشیت الہی سے پُر نور رہتی تھیں۔ اور جب یہ جاننے والے آج حضرت کی ان اداؤں کو یاد کرتے ہیں۔ تو پیرے اختیار روتے رتے اُن کی ہچکی بندھ جاتی ہے۔

اس ملک اور اس دور میں مدارس و جماعتیں بہت سے عظیم عالم اور مدرس بھی موجود ہیں اور خانقاہوں میں مختلف سلسلوں کے صاحب ارشاد اصحاب طریقت و صوفی بزرگ بھی مصنف و مؤلف بھی ہیں۔ اور داعط و خطیب بھی۔ مذہبی رہنما بھی ہیں اور سیاسی لیڈر بھی، ہر ایک اپنے اپنے رنگ میں دین کی خدمت کر رہا ہے۔ اور قابلِ مدد شکر یہ ہے۔ اللہ تعالیٰ اُن سب کو جزائے خیر دے۔ لیکن ان حضرات میں سے ہر ایک کا صرف ایک ہی رنگ ہے۔ اور ایک ہی مسئلہ، اور اس کام کو اس طرح نبھا رہا ہے۔ کہ ساری توجہ اس کی طرف مبذول ہے۔ مگر اس دور میں جامع شخصیت حضرت شیخ ہی کی تھی۔ مدرس و معلم کیا صدر المدینین اور فخر المملین بھی تھے۔ اور چاروں سلسل طیبہ کے مجاز طریقت۔ اور خانقاہ رشیدی کے اسرارِ رشد و ہدایت کے امین، اور لاکھوں کی تربیت و تزکیہ کرنے والے مرشد اعظم بھی، تصنیف و تالیف کے میدان میں بھی حسبِ ضرورت کام کیا۔ اور وعظ و خطبے کے ذریعہ بھی دُعا خیر کے پہاڑوں سے لے کر برباد و آسمان تک ساری کائنات پر پہنچا دیا تھا۔ مذہبی قیادت و سیادت کے اعتبار سے بھی شیخ ادکل اور سید السادات تھے اور ساداتِ عالم سے لیکر اب تک متواتر اسلحہ جمعیتہ علمائے ہند کی صدارت کی۔ اور اس سے قبل بھی علامہ آپ ہی صدر جمعیت اور امیر جماعت تھے۔ اور آپ کی رہنمائی ہی میں تمام علمائے کرام کا قافلہ ہمدانِ دعال رہا۔ اور سیاسی لیڈر بھی آپ تھے۔ اور ملک کی آزادی کے سلسلہ میں ہر لیڈر سے بڑھ کر آپ نے حصہ لیا۔ اور ایک جرنیل کی طرح کام کیا۔ بس یہی جامعیت حضرت کی وہ خصوصیت ہے جس کی نظیر اس دور میں نہیں مل سکتی۔ اور سب بقہ زمانوں میں بھی شاید یہ شکل سے ملے گی۔

تَفَرَّقَ فِي الْأَبْرَارِ مَا هُوَ جَا مَعًا

اور ایک ہاتھ میں "جامِ شریعت" اور دوسرے ہاتھ میں "سندانِ عشق" لے کر "جامِ دستانِ باختر" کا عمل نمونہ آپ ہی تھے۔ اور

یہ ایک خصوصی کمال اور عظمتِ الہی ہے اور آپ کا وجود

ان یجمع العالم فی الواحد

لیس علی اللہ بمستنکر

کی زندہ مثال تھی اور بقول مولانا بنوری زید مجدہ آپ اس دور میں آیاتِ من آیات اللہ تھے۔ اور اس لئے جب تک یہ نعمت ہم میں موجود تھی۔ ہم ہر دُورے سے مستفنی تھے

سَلَوْتُ بِهِ عَنْ كُلِّ مَنْ كَانَ قَبْلَهُ

اور آج جب ہم اس نعمتِ عظمیٰ سے محروم ہو گئے تو سہ چہ کنم کہ چشمِ بر بن نہ کند بہ کس نگاہے کا معاملہ درپیش ہے۔ اور ہم پر ایک مایوسی کی کیفیت طاری ہو رہی ہے۔ اور کسی اور پر نگاہیں جتنی نہیں اور سمجھ میں نہیں آتا کہ کون اس خلا کو پُر کر سکے گا۔

وَاذْهَلَنِي عَنْ كُلِّ مَنٍ هُوَ تَابِعُهُ

یوں تو ہم میں سے ہر ایک آج اپنے اپنے ادراک اور احاطہ علم کے مطابق حضرت شیخؒ کے فضائل و مناقب اور کمالات و اوصاف بیان کر رہا ہے اور یاد کر کے رو رہا ہے۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ آپ کی اصل وجہ فضیلت اور امتیازی وصف کمال کی تیسرے پھر بھی نہیں کی جاسکتی۔ میں سمجھتا ہوں کہ جس چیز نے حضرت شیخؒ کو اپنے زمانہ کے تمام علماء و مشائخ، محدثین و مفسرین، مدرّسین و مصنفین، خطباء و رہنمایان ملک و ملت سے ممتاز اور افضل بنا دیا تھا اور جس کی وجہ سے زندگی میں ہزاروں علماء و فضلاء اور مشائخ و صوفیاء آپ پر جان چڑھ گئے، اپنے آپ کو قربان کرتے اور انہیں بچاتے تھے۔ اور اب رحلت کے بعد جس چیز کے ہاتھ سے چلے جلنے کی وجہ سے دل لرز رہے، ہاتھ کانپتے اور آنکھیں آنسو بہا رہی ہیں۔ وہ کچھ حضرت کی بعض الٰہی ادائیں تھیں جن کی صحیح تعبیر تو مینح الغافلین کوئی بھی نہیں کر سکتا لیکن اس کا ادراک سب کرتے تھے۔ اور جس سے متاثر سب ہوتے تھے۔ اور جس کو عروس کرنے کے بعد بے اختیار طبعی غرور والوں کی گردنیں بھی جھک جاتی تھیں اور شیخت کے دعوے بھی مانڈ پڑ جاتے تھے۔ اور خاندانی اور نسبی تفاخر کی باتیں بھی ختم ہو جاتی تھیں۔ اور ہر کسی کو طوعاً و کرہاً یہ اثر راکرنا پڑتا تھا کہ

آقا کہا گرویدہ ام مہربان و زریذہ ام
حضرت کی ان خصوصی اداؤں نے ایک عالم کو شکار کر دیا تھا۔ اور انہی کی وجہ سے کتنے ہی سرکش اور بدکنے پھرنے والے آخر کار دام عقیدت و محبت میں گرفتار ہو جاتے تھے۔ اور نصف مزاج و دشمنوں اور مخالفوں کو بھی اعتراف کرنا پڑتا اور وہ سپردال دیتے تھے۔ اور یہ بے نام ادائیں ہی ہوتی ہیں جو کسی ذات کے لئے خصوصی طور پر وجہ محبوبیت و مقبولیت بن جاتی ہیں۔ کسی سنہ بالکل سچ کہا ہے کہ

خوبی نہیں کرشمہ و ناز و خرد ام نیست
بسیار شیوہ ہاست بتاں کہ نام نیست

حضرت شیخؒ اپنے اسلاف کی ایک ایسی یادگار تھے جن کے ذریعہ سے ان حضرات کی روایات زندہ تھیں۔ اور حضرت کی ذات ایک ایسا آئینہ تھا جس میں ان کا برسلف کے حسن اخلاق اور حسن اعمال اور فضائل و کمالات کی جملہ آرائی نظر آرہی تھی۔ لیکن اس پر بھی تواضع اور عجز و انکسار کا یہ عالم تھا کہ محض تکلفاً اور تصنعاً نہیں بلکہ حقیقتاً اپنے آپ کو "تنگ اسلاف" سمجھتے اور لکھتے تھے۔ اپنے کو "تنگ اسلاف" سمجھا تبھی تو فخر اسلاف اور وارث اسلاف کہلائے۔ اپنے روحانی مرتبوں اور اساتذہ کے ساتھ عقیدت و محبت اور پھر خدمت گزاری کا جو تعلق حضرت نے قائم کیا تھا دوسرا کوئی مترشح و شاگرد ایسا قائم نہیں کر سکتا۔ حضرت "شیخ الہند" پر جان قربان کر چکے تھے۔ اور اس کے عمل نمونے دنیا کو دکھا دئے تھے۔ اور اسی کا اثر تھا کہ حضرت شیخ الہند کا پورا رنگ پختہ طور سے آپ پر چڑھ چکا تھا۔ اور اس لئے دنیا خود بخود اس پر مجبور ہوئی کہ آپ کو جانشین شیخ الہند قرار دے۔ اور جی یہ ہے کہ شیخ الہند کے اس جان نثار خادم اور تلمیذ رشید نے اپنے مخدوم اور اساتذہ کی جانشینی کا حق ادا کر دیا جس رستے پر حضرت الاستاذ چل رہے تھے اور تلامذہ کو چلانا چاہتے تھے یہ سواد تلمذ شاگرد آخری دم تک اسی راستہ پر چلتے رہے۔ اور لا حول کو اسی راستہ پر اپنی قیادت میں گامزن کر دیا۔ انگریز کے ساتھ قلبی انقبض و عداوت اور اس نخوس قوم سے نفرت و بیزاری، اور اس کے مقابلہ کے لئے ننگی تلوار بن کر میدان میں نکلنا یہ حضرت شیخ الہند کا خصوصی جذبہ تھا۔ اور حضرت مدنیؒ نے اساتذہ کے اس جذبہ کو بدرجہ کمال اپنے قلب کی کیفیت بنا دیا تھا۔ اور انگریز کی عداوت آپ کی رگ رگ میں سما گئی تھی۔ اس موقع پر مولانا عبدالمجید دیوبادی کی ایک عبارت یاد

آئی۔ کچھ سے قریباً ۲۹ سال پہلے مولانا دیوبادی نے اپنے سفرِ حج کے سلسلہ میں اپنے سفرنامہ حجاز میں شیخ سنوٹی سے اپنی ملاقات کا ذکر کیا ہے۔
طرابلس کے اس مجاہدِ عظیم کی زیارت کے ساتھ لازماً ہندوستان کے مجاہدِ البر شیخ مدنی کی یاد آئی ہے۔ "سلوک بطریق نبوت" کی مثالیں دیتے دیتے لکھتے ہیں۔

"حضرت شیخ الہند دیوبندی رحمۃ اللہ علیہ کا جہاد اور ذوقِ شہادت تو موجودہ نسل کی آنکھوں دیکھی بات ہے۔ اُسے کون بھول سکتا ہے۔ اسے کیونکر بھلایا جاسکتا ہے؟ اور پھر شیخ الہند کے بعد، آج بھی خدائے جی و قیوم کے فضل و کرم سے ایک زندہ سلامت ذات ہند اور اہل ہند کے درمیان موجود ہے۔ جو اسے دیکھ اور پہچان چکے وہ اپنی آنکھوں کو مبارکباد دیں۔ اور جنہوں نے نہیں دیکھا اور نہیں پہچانا انہیں دکھانے اور پہچاننے کی اجازت ہے۔"

(سفرنامہ حجاز ص ۳۵)

ہائے افسوس! کہ وہ "زندہ و سلامت ذات" آج ہمارے درمیان سے رخصت ہو کر اپنے رب کے ہاں پہنچ کر زندہ جاوید ہو گئی۔ اور اب ہند اور اہل ہند کے درمیان موجود ہونے کی بجائے اعلیٰ علیین میں ارواحِ طیبہ اور عباد اللہ کے زمرہ میں تشریف فرما ہے۔ اور شیخ الہند کا یہ جانشین اور مولانا محمد قاسم نانوتوی کا یہ عقیدت کیش خادم آج مولانا نانوتوی کے قدموں میں اور حضرت شیخ الہند کے پہلو میں آرام فرما ہو گیا ہے۔ قدس اللہ اسرارہ و افاض علیہ انوارہ و رحمۃ رحمتہ و واسعۃ کاملہ

الغرض کیا کیا لکھا جائے اور کہاں تک لکھا جائے۔ یوں تو رنج و غم کے غار سے قلم مست دبے ہوش ہے اُسے لکھنے کے لئے کھلا چھوڑ دیا جائے تو بہت کچھ لکھ سکتا ہے لکھتا ہی ہے گا۔ اور اُسے یہ ہوش ہی نہیں کہ اس حکایتِ ہجرت و فراق اور "ماتم حسین" میں اُس نے کافذ کے کتنے صفحوں کو سیاہ کر کے لباسِ ماتم پہنا دیا۔ لکھنے والے کا ہاتھ بھی قلب کی دافنگی کی وجہ سے از خود رفتہ ہے۔ اور وہ غمِ اندوہ کے بیابان میں "مشقِ نامِ سیلی" سے اپنی خاطرِ فراق کو تسلی دینے کی کوشش کر رہا ہے۔ لیکن جذبات پر قابو پانا، اور کیفیاتِ قلبی کو اعتدال میں رکھنا عقلِ شرع کا فیصلہ اور حکم ہے۔ اس لئے جبکہ ما اصاب من مصیبت فی الامر من دلائل فی النفس کم الا فی کتاب من قبل ان نبرأھا الایہ کے مطابق تقدیرِ الہی اور فیصلہ لوحِ محفوظ کی بنا پر یہ حادثہ رونما ہو چکا۔ اور اس نعمتِ عظمیٰ سے متمتع ہونے کا وقت ختم ہوا اور کل شئی عندہ بمقتدار کے مطابق اس سے ارتفاع و استماع کی مدت پوری ہو گئی۔ اور اللہ ما اخذ ولہ ما اعطى کے ارشادِ نبوی کے مطابق اللہ تعالیٰ نے اپنا ہی عطیہ اب اپنے بندوں سے لے لیا۔ اور اپنے دوست کو اپنے ہاں بلالیا۔ تو اب جزع و فزع کی بجائے صبرِ استقامت و ثباتِ استقلال اور دعا گوئی کی ضرورت ہے

اَيْتَهَا النَّفْسُ اَجْمَلِيْ جِزْعًا فَاِنَّ مَا تَحْذَرُ مِنْ قَدْرٍ وَقَعَا

پُروردگارِ عالم اس مجاہدِ جلیل کی روحِ مطہرہ پر اپنی بے پایاں محبتوں کی بارش فرمائے۔ اور اعلیٰ علیین میں اعلیٰ ترین مراتبِ درجات سے سرفراز فرمائے۔ اور اُن کے اُس مرتدِ مبارک کو جو اُن جیسے مقدس دپاکیزہ بزرگوں کے جوار میں واقع ہے پُرورد فرمائے۔ اور اس مصیبتِ عظمیٰ سے متاثر ہونے والے تمام افرادِ خاندان، طلبہِ علومِ دینیہ اور علماءِ کرام، تمام مترشدین و متعلمین اور تمام مسلمانوں کو صبرِ جمیل اور استقلالِ استقامت کی نعمت سے نوازے

سیاح الدین عفی عنہ، ۱۲ دسمبر ۱۹۵۸ء

فسق و تقویٰ کی کشمکش

اور دین کے خادموں کو دعوتِ فکر

از جناب مولانا محمد اسحاق صاحب سندیلوی، ڈیڑی استاد حدیث سماشیات دارالعلوم ندوۃ العلماء، لکھنؤ

[اس مضمون کے خاص مخاطب وہ بندگانِ خدا ہیں جن کو اللہ تعالیٰ نے دین کا درد و فکر اور دین کی خدمت و نصرت کا جذبہ عطا فرمایا ہے۔ اور وہ بددینی کے مقابلہ میں دینداری کو اس دنیا میں غالب دیکھنا چاہتے ہیں۔ اور اس مقصد کے لئے کچھ کرتے رہتے ہیں یا کرنا چاہتے ہیں۔ مضمون اگرچہ خاصا طویل ہے۔ لیکن اپنے تشکلات اور صاحبِ مضمون کے اخلاص کی وجہ سے اس کا مستحق ہے کہ دین کا ہر سچا اور مخلص خادم اس کو پڑھے۔ یہ اہم مضمون رسالہ الفرقان لکھنؤ میں شائع ہوا ہے۔ مضمون کی اہمیت محسوس کرتے ہوئے ہم نے ضروری سمجھا کہ قارئین شمس الاسلام کی خدمت میں بھی یہ غور و فکر کے لئے پیش کیا جائے]

مرتب

ہوں یا عامی۔ دوسرے سخن مخصوص طور پر علماء و مشائخ کی طرف ہرگز نہ سمجھا جائے۔ اس لئے کہ یہاں جس کشمکش پر بحث کرنا ہے اس میں صرف علماء و مشائخ ہی مبتلا نہیں ہیں بلکہ فسق و تقویٰ کی کشمکش ایک ہر گز کشمکش ہے جس میں ہر دیندار مسلمان شعوری یا غیر شعوری طور پر حصہ دار ہے۔

یہ ایک اندرونی جنگ یا نفسی مرکز آرائی ہے جو خود امت کے اندر جاری ہے۔ اور کفر و اسلام کی کشمکش سے مختلف مگر اس سے زیادہ خطرناک ہے۔ یہ ایسی عجیب جنگ ہے جو خود اپنے خلاف لڑنا پڑتی ہے۔ اور ہمہ وقت جاری رہتی ہے۔

یہی مرکز صدیوں سے جاری ہے۔ ایک طرف امت کا وہ طبقہ ہے جو حق تعالیٰ کا فرمانبردار ہے۔ اور یہ چاہتا ہے کہ سارے عالم

دیندار اور دنیاوالہ یہ دو طبقے ہیں جن میں مسلم معاشرہ تقسیم ہو چکا ہے۔ تقسیم کی تاریخ سے ہمیں بحث نہیں لیکن اتنی بات کہہ دینے میں کوئی مضائقہ نہیں ہے کہ اس کی ابتداء ہماری شامت اعمال سے وابستہ ہے۔ دینی حس پر تقسیم بہت گراں ہے۔ اور کیوں نہ ہو۔ جبکہ اسلام کے نزدیک لفظ ”دنیا دار مسلمان“ بالکل بے معنی ہے۔ نہ اس کے نزدیک دین و دنیا کی ایسی تفریق روا ہے جس سے ان دو طبقوں کا ظہور ہو۔ لیکن ہزار تلخ ہونے کے باوجود تقسیم ایک حقیقت بن چکی ہے۔ اور امت کے دینی مسائل پر غور کرتے وقت اسے نظر انداز کر دینا کسی طرح صحیح نہیں کہا جاسکتا۔

اس وقت میرا مخاطب مسلمانوں کا دیندار طبقہ ہے۔ یعنی وہ طبقہ جو دین کو دنیا پر مقدم رکھتا ہے۔ خواہ اس کے افراد عالم

بہت سی دینی تحریکیں اور جماعتیں پیدا ہوئیں۔ بعض باقی ہیں، بعض ختم ہو گئیں لیکن ان کی خدمات کا اعتراف ذکرنا کتمان حق بھی ہے۔ اور ایک قسم کی ناشکری بھی۔ جماعتوں سے قطع نظر اس صدی کے سرمایہ افتخار اور علم و تقویٰ کے خزانہ دار ایسے علماء و مشائخ سے ہیں جن میں سے ہر فرد اپنی جگہ پر ایک امت اور جماعت تھا۔ بہت سی اچھی خاصی بڑی اور مشہور و مقبول جماعتوں نے دینِ متین کی اس قدر خدمت نہیں انجام دی ہے جس قدر ان میں سے بعض حضرات نے تنہا انجام دی۔ اور آج بھی بعض علماء و صلحاء ایسے موجود ہیں جو تنہا ایک بڑی جماعت کی قائم مقامی کر رہے ہیں۔ جہاں تک دینی لٹریچر کا تعلق ہے اس دور میں اشاعتِ دین کے سلسلہ میں جیسی بلند پایہ تصنیفات و مضامین شائع ہوئے ہیں۔ اس کی نظیر بہت کم ملے گی۔ قدامت پسندی کی تو بات ہی دوسری ہے۔ مگر سچی بات یہی ہے۔ کہ اس صدی کی بعض تالیفات کے مقابلہ میں ماضی کی چار چھ صدیوں کے اندر کوئی چیز نہیں بن سکتی۔ بلکہ ممکن ہے کہ سلسلہ اس سے بھی کچھ آگے پہنچ جائے۔

یہاں جماعتوں، تحریکوں وغیرہ کا استقصا مطلوب نہیں ہے بلکہ اجمالی طور پر اس محاذ کا ایک نقشہ سامنے لانا ہے۔ جہاں تقویٰ فسق سے دست دگر بیان ہے۔ نقشہ نامکمل ہے گا اگر مخالف کیمپ پر بھی ایک اجمالی نظر نہ ڈال لی جائے۔

تقویٰ اور اطاعتِ الہی جس طرح مختلف طریقوں سے فسق و فجور کو مٹانے کی کوشش میں مصروف ہے اسی طرح فسق و فجور بھی مختلف طریقوں اور متعدد ذرائع سے اسے ختم کر دینے کی جدوجہد کر رہا ہے آج کی دنیا میں جتنے وسائل و ذرائع کسی چیز کی اشاعت کے ہو سکتے ہیں ان سب کا استعمال شریعت کے باغی کر رہے ہیں۔ اور اس بنیاد کو مقبول بنانے کے لئے ایڈیٹری، چوٹی کا ذور لگا رہے ہیں۔ مزید برآں

میں نہ سہی تو کم از کم مٹانے کی اُمت میں اس اطاعتِ الہی کا رواج عام ہو جائے اور مسلمانوں کی زندگی کا ہر شعبہ اسلامی بن جائے۔ اس کے مقابلہ میں وہ طبقہ ہے جو حق تعالیٰ جل شانہ سے بغاوت کا اعلان تو نہیں کرتا، مگر علیٰ زندگی کو کلیتہً احکامِ الہی سے آزاد رکھنا چاہتا ہے۔ یہی نہیں بلکہ مسلم سوسائٹی کو ایک ایسی فساد سوسائٹی بنا دینا چاہتا ہے جس کا شعار فسق "اور حق تعالیٰ کی نافرمانی ہو۔"

صدیوں کی بات کو چھوڑیے صرف ایک آدھ صدی پر غور کر کے مڑ کر زلزلہ کا جائزہ لیجئے۔ اور سوچئے کہ اس کشمکش اور تصادم میں کون مار رہا ہے اور کس کی جیت ہو رہی ہے؟

غلبہ تقویٰ کے لئے ہم نے کیا کیا؟ اس کے جواب میں ان سب دینی تحریکوں، جماعتوں، اور اکابر علماء کی کوششوں کو پیش کر سکتے ہیں جو اس صدی میں موجود ہیں اور آج بھی بہت کچھ موجود ہیں۔

جہاں تک اشاعتِ تقویٰ کے تدابیر و مساعی کا تعلق ہے۔ یہ صدی شاید ایک امتیازی شان رکھتی ہے۔ اور بہت سی صدیوں کے سامنے سمرِ افتخار بلند کر سکتی ہے۔ نظام الدین دہلی کی تبلیغی تحریک کی ایسی وسیع، عام پسند اور کثیر التعداد مخلصین کی کیا ب، بلکہ نیا یا ریہ دولت سے مالا مال کوئی تحریک شاید ہی کوئی صدی پیش کر سکے۔ جماعتِ اسلامی سے کوئی شخص ہزار اختلاف کرے۔ مگر یہ ماننا پڑے گا کہ متکلمانہ انداز پر اس نے بھی اسلام کی اچھی خاصی خدمت انجام دی ہے اور دے رہی ہے۔ ممالکِ اسلامیہ میں اخوان المسلمین کی عظیم اشان تحریک بھی اپنے خصوصیات کے لحاظ سے اس صدی کی امتیازی شان میں اچھا خاصہ اضافہ کرتی ہے۔ اس کے باقی نے کلام و تصوف کی جیسی اچھی اور متناسب آمیزش کی تھی وہ شاید ہی کہیں مل سکے۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ اس تحریک نے دل و دماغ دونوں محاذوں پر فسق کا مقابلہ کیا۔

ان تحریکوں اور جماعتوں کے علاوہ بھی دنیا بھر میں اسلام میں

صحت کے متعلق اس قدر یقین کہ اس پر نظر ثانی کی ضرورت کبھی نہ محسوس ہو اس بات کی کھلی ہوئی علامت ہے۔ کہ آپ غیر شعوری طور پر اپنے ماحول سے متاثر ہیں۔ اور ایک خاص حلقہ میں کامیابی یا ایک خاص طرز کی کامیابی کو آپ نے فسق کی پسپائی سمجھ لیا ہے۔

اس دھوکے میں وہ لوگ خصوصیت کے ساتھ مبتلا ہیں جو کسی خاص تحریک یا کسی خاص طرز خدمت دین سے وابستہ ہیں۔ حدیث ہے کہ بعض حضرات تو اپنے طرز کار کو اس قدر یقینی سمجھتے ہیں۔ گویا کہ وہ کوئی منصوص شے ہے جس میں ترمیم و تہذیب نہ صرف بے ضرورت بلکہ ایک درجہ میں ناجائز ہے۔

عسکری تربیت کا ایک بڑا جزو جماعتی کام (ٹیم ورک) کی تربیت ہوتی ہے۔ اس فوج کی شکست و ناکامی یقینی ہے جس کا ہر سپاہی اپنے رفقاء سے بے خبر اور بے پروا ہو کر صرف اپنی مانت کی فکر میں ہے۔ یہ ایک مثال ہے جس سے انفرادیت پسندی کی مضرت عیاں ہے جس شخص کا نظریہ یہ ہو کہ مجھے صرف اپنی طرف نظر کرنے کی حاجت ہے۔ خواہ ساری اُمت فسق و فجور کے جنگل میں پھنس چلے۔ اس سے یہ توقع رکھنا کہ وہ اُمت کی صحیح حالت کا اندازہ کر کے بالکل نادانی ہے۔ تاریخ بتاتی ہے کہ اقوام و ملل کے عہد زوال میں یہ چیز ان میں پیدا ہو جاتی ہے اور ان کے جسم کے جوڑ جوڑ کو الگ کر دیتی ہے۔ خیر تو ان پردوں کو ہٹا کر زیادہ نہیں صرف ایک صدی کا جائزہ لے لیجئے۔ کہ اس عرصہ کی پہم کشمش میں آپ نے کیا پایا اور کیا کھو دیا؟

اتنی بات کہنے میں مجھے کوئی باک نہیں ہے۔ کہ دیندار طبقہ کی اکثریت نہیں تو کم از کم ایک کثیر تعداد مندرجہ بالا دونوں غلطیوں (یعنی فریب ماحول اور انفرادیت) میں سے کسی میں مبتلا ہے۔ تاہم ایسے حضرات بھی اچھی خاصی تعداد میں موجود ہیں۔ جو ان سے محفوظ

کفر بھی فسق کی پشت پناہی کر رہا ہے۔ اور اپنی پوری قوت اس کی اشاعت و ترویج کے لئے صرف کر رہا ہے۔ گویا کہ کفر کا مقصد ہی اشاعت و فحور ہے۔ اور زمانہ آئیہ کریمہ

بَلْ يُرِيدُ الْإِنْسَانُ } بلکہ انسان فسق و فجور میں مبتلا
يَتَجَمَّرَ إِلَىٰ آثَمَةٍ { رہنا چاہتا ہے
کی عملی تفسیر پیش کر رہا ہے۔

یہ اس میدان جنگ کا اجمالی نقشہ ہے جس کی وسعت تقریباً پورے کرہ ارض کو گھیرے ہوئے ہے۔ اور نہ صرف سطح ارض بلکہ ہلے دل و دماغ کو بھی اپنے احاطہ میں لئے ہوئے ہے۔ آئیے اسی نقشہ پر ایک گہری نظر ڈال کر معلوم کریں کہ فریقین میں سے کس کا پتہ بھاری ہے۔ کسے فتح ہو رہی ہے اور کسے شکست؟

صحیح نتائج اخذ کرنے کے لئے ان دیواروں کو گرا دینا ضروری ہے جو ہمارے اور حقیقت حال کے درمیان حائل ہو جاتی ہیں۔ پہلی چیز فریب ماحول کے مختصر عنوان سے ظاہر کی جا سکتی ہے۔ جو دیندار حضرات دیندار ماحول میں زندگی بسر کرتے ہیں اور ایسے خوش نصیب بکثرت ہیں۔ (خصوصاً علماء و مشائخ) وہ اُمت کی صحیح حالت کا اندازہ مشکل کر سکتے ہیں۔ موجود پر غائب کو قیاس کرنا انسان کا فطری طریق تہذیب ہے۔ ایسے حضرات عموماً غیر شعوری طریقہ سے اس راستہ پر گامزن ہو جاتے ہیں۔ اور ماحول کی رونق کو دیکھ کر یہ سمجھ لیتے ہیں کہ "اُمت بیمار" کا حال اچھا ہے۔ مگر یہ کہ بہت سے لوگ میری اس تشخیص کا انکار کر دیں۔ لیکن میں ان سے پوچھوں گا کہ اگر آپ کو واقعی اُمت کی حالت کا صحیح اندازہ ہے تو آپ اپنی روش اور کرد و کار پر مطمئن کیوں ہیں؟ کیا کسی دشمن کے مقابلہ کے لئے ایک بندھے ٹکے طریقہ پر عمل کرنا ہمیشہ کافی ہوتا ہے؟ خصوصاً جب دشمن انتہائی تہذیب و دل سے مقابلہ کر رہا ہو؟ ہو سکتا ہے کہ آپ کی تدبیر بالکل صحیح ہو۔ لیکن اس کی

ہے۔ اور اچھے اچھے دیندار اور عالی دماغ اس مغربی کا بوس کا شکار ہیں۔ جو ابھی تک اس دجالی جنت سے باہر ہیں۔ وہ اپنی ابد پائی کے شاکی اور رسائی کے متمنی ہیں۔ مستثنیات سے انکار نہیں مگر وقلیل ماہم۔

مسلم معاشرے کے ان پھوٹوں کو چھڑنا بہت تکلیف دہ ہے۔ مگر کیا جائے اس کے سوا کوئی علاج نہیں۔ ثقافت کا دائرہ معاشرت کو بھی گھیرے ہوئے ہے۔ اس لئے اس پر علیحدہ گفتگو کی حاجت نہیں ہے۔ مگر اخلاق بنیاد ثقافت ہونے اور ایک مستقل حیثیت رکھنے کی وجہ سے مستقل نظر کے تحت ہیں۔ نظریہ ناگوار منظر پیش کرتی ہے۔ کہ اخلاق کے اسلامی تصورات ہی تقریباً مفقود ہو چکے ہیں۔ مثلاً جاہ پندی، شہرت پسندی کو معاصی کی فہرست سے خارج کر کے حی سن یا کم از کم مباحات کے حیطہ میں جگہ دی گئی ہے۔ خود داری کے حدود کسین کر کے تکبر تک پہنچا دیئے گئے ہیں۔ میں نے بعض اچھے خاصے اہل علم کو دیکھا ہے۔ کہ تکبر و خود داری اور تواضع و

تذلل کے حدود سے بالکل ناواقف ہیں۔ تا جابا ہلداں را چہ رسد یہ چند مثالیں ہیں جن سے دوسرے اخلاق کا اندازہ لگایا جاسکتا ہے لہبیت، اخلاص، صدق، مروءت، ایثار اسی قسم کے الفاظ کا مفہوم سمجھنے والے تو اب آسانی سے گئے جاسکتے ہیں۔ انفرادی حیثیت کو چھوڑ کر اب اجتماعیات کی طرف آئیے۔

سیاسی اقتدار کو یا فساد و فجار کا حصہ بن چکا ہے۔ یہاں مستثنیات کی تلاش میں آپ کو بہت زحمت اٹھانا پڑے گی۔ اور اس کدو کا دش کے بند و مستثنیات ملیں گے۔ وہ ناقابل اعتنا ہوں گے۔ یقین نہ ہو تو اسلامی دنیا کا جائزہ لے لیجئے۔ معاشی زندگی کی تنظیم اور اس کی قیادت بھی اسی طبقہ کے ہاتھ میں پہنچ چکی ہے۔ اور دیندار طبقہ وہاں سے بھی نکالا جا چکا ہے۔ جب وہ آپ کو حرام کھانا چاہتے

ہیں۔ ایسے لوگ اس تلخ دناگو حقیقت کا احساس بہت آسانی سے کر سکتے ہیں۔ کہ فتنہ و تقویٰ کی اس کشمکش میں ہر محاذ پر فسق کو فتح اور تقویٰ کو مسلسل شکست ہو رہی ہے۔

سب سے پہلے اس چیز کو لیجئے۔ جو کسی قوم کی عملی زندگی کی بنیاد ہوتی ہے۔ میری مراد دینی شعور ہے۔ ہر منصف مزاج صاحب بصیرت اس کا اعتراف کرے گا کہ اُمت مسلمہ میں بحیثیت مجموعی یہ جو ہر روز بروز کم ہوتا جاتا ہے جس کا اثر یہ ہے۔ کہ باوجود پیہم اور قوی تحریک کے اُمت میں حرکت نہیں پیدا ہوتی۔ اور عالم میں اپنے صحیح مقام کو حاصل کرنے کی اُننگ دلوں کو نہیں گدگداتی بلکہ ہر شعبہ زندگی سے دین کا انسراج ان کا عجوبہ بننا جاتا ہے عقل ماد تنیزی کے ساتھ انحطاط پذیر ہے۔ اور فہم دین روز بروز قدر گھٹتی جاتی ہے کہ معمولی عام فہم دینی مسائل میں اچھے خاصے پڑھے لکھے اس طرح اُلجھتے ہیں کہ شاید اب سے صدی دو صدی پیشتر جہلا بھی نہ اُلجھتے ہوں۔

دینی شعور کے اس انحطاط کا سب سے بڑا اثر اسلامی تہذیب ثقافت پر پڑا ہے۔ اگرچہ صحیح معنی میں اسلامی تہذیب تو بحیثیت مجموعی اُمت سے اب سے بہت پہلے رخصت ہو چکی تھی۔ مگر مسلمانوں کی تہذیب ثقافت کے نام سے ایک چیز موجود تھی۔ جو بحیثیت مجموعی غیر اسلامی ہونے کے باوجود اپنے اندر کچھ کیا اچھے خاصے اسلامی عناصر و اجزاء رکھتی تھی۔ یہ بیجا پری مغربی تہذیب کے سیلابِ عظیم کا کیا مقابلہ کرتی۔ اس کے غیر اسلامی اجزاء رسمی اور فرسودہ ہونے کی وجہ سے بہہ گئے۔ اور اپنے ساتھ اسلامی اجزاء کو بھی بہا لے گئے افسوس جس چیز نے سیلِ تانار کا رخ بدل دیا تھا۔ وہ سیلِ مغرب کے سامنے بالکل نہ ٹھہر سکی۔ غیر اسلامی مالک کو جانے دیجئے اسلامی مالک کا حال دیکھئے۔ مغربیت کس طرح ان کے دل و دماغ پر مسلط

ہیں۔ تو بیٹ بھر کر کھلا دیتے ہیں۔ اور آپ اس میں ایک لقمہ کی بھی کمی نہیں کر سکتے۔

جسم ہی نہیں بلکہ آپ کے ذہن و دماغ کی غذا بھی عموماً فاسق ہی کے اختیار میں ہے۔ بھوڑے سے عربی مدارس کو متشی اکو کے پورے نظام تعلیم پر اسی قسم کے افحاص چھائے ہوئے ہیں۔ اور سیرت سادہ کے ان کارخانوں میں دیندار بخیر شاہ دودار ہی ملیں گے۔ اور جو ملیں گے وہ بھی بے اثر ہوں گے۔ خلاصہ یہ کہ ہماری اجتماعی زندگی کلید فساد و فحار کے قبضہ میں پڑ چکی ہے۔ اس میں متشیات کی حیثیت طوفانی سمندریں چھوٹے جزیروں کی ہے۔ انہیں دیکھ کر مطمئن ہو جانا بلاشبہ ناواقف ہے، اگر طوفان کی رفتار و شدت یہی رہی تو کچھ عرصہ کے بعد ان جزائر کی غرقابی بھی یقینی نظر آتی ہے۔ اجتماعی قیادتوں میں صرف ایک قیادت بھی ایک دیندار طبقہ کے ہاتھ میں ہے۔ یعنی دینی قیادت۔ مگر وہ دینی قیادت جو صرف مسلمان کی انفرادی زندگی تک محدود ہو۔ اس کے لئے آپ اجتماع کی دعوت دے سکتے ہیں۔ اور ان کی رہنمائی کر سکتے ہیں۔ مگر اب ”کوئی آستینوں“ کی دراز دستیوں اس کی پگڑی بھی دیندار طبقہ کے سر سے اتار لینا چاہتی ہے۔ ”برقی فتنہ“ ”پیویری بدعت“ ”وہد ادیان“ کی تحریک اور اس قسم کی دوسری گمراہ کن تحریکیں اس رجحان کا پتہ دیتی ہیں۔ جو طبقہ فساد میں پیدا ہو رہا ہے۔ صاف معلوم ہوتا ہے۔ کدہ مسجد کے گوشے یا خانقاہ و مدرسہ کے حجرے میں بھی دین کی موجودگی گوارا کرنے کے لئے تیار نہیں ہیں۔ اور اس شجرہ طیبہ کو جڑ سے اکھاڑ پھینک دینا چاہتے ہیں۔

حالات کی اس تصویر میں طوالت کا اعتراف تو کر سکتا ہوں مگر رنگ آمیزی اور مبالغہ تسلیم کرنے کے لئے تیار نہیں ہوں۔ میں نے قسم سے کیرہ کا کام لیا ہے نہ کہ موتلم کا کشمکش کے صحیح نقشہ کی عکاسی کر دی ہے۔ اس میں رنگ نہیں بھرا ہے۔ مگر سچ تو یہ ہے کہ

مجھے خوف ہے۔ کہ کوئی صاحب بصیرت میرے اُدپر کی کرنے کا الزام نہ لگائے اور اگر یہ الزام مجھ پر لگایا جائے گا۔ تو غالباً میں اس کے اعتراف پر مجبور ہوں گا۔

ان حالات کو پیش نظر رکھتے ہوئے کیا یہ ضروری نہیں ہو جاتا کہ ہم فسق کے مقابلہ اور تقویٰ کے فروغ کے لئے اب تک جو تدابیر کرتے رہے ہیں ان پر نظر ثانی کریں؟ ہو سکتا ہے کہ اس غلویت کا سبب فسق کی طاقت اور اس کے ذرائع کی فراوانی ہو۔ لیکن کیا اس کا احتمال بھی نہیں نکلتا کہ اس سبب کے ساتھ خود ہماری اندر بھی بعض کمزوریاں ہوں۔ یا ہماری کسی تدبیر میں غلطی ہو۔ جو اس شکست نفسی میں حصہ دار ہو؟ میں ہرگز یہ نہیں کہتا کہ اشاعت تقویٰ کی جو مختلف کوششیں ہو رہی ہیں وہ غلط ہیں یا ہر ایک میں یقیناً کوئی نہ کوئی غلطی ہے۔ حاشا دکلا نہ مجھے اپنی بصیرت کے متعلق ایسی خوش فہمی ہے نہ دین کے خدام کے متعلق اس قسم کی غلط فہمی، میں تو صرف متاع عرض کرتا ہوں کہ ہم میں سے کوئی بھی معصوم نہیں ہے۔ اور خدمت دین کے جتنے طریقے مختلف افراد اور جماعتوں نے اختیار کئے ہیں ان میں سے کوئی معصوم نہیں ہے۔ ان کا درجہ تہذیب سے آگے نہیں بڑھا۔ حالات کی تبدیلی بسا اوقات ایک مفید طریقہ کے کچھ عرصہ کے بعد قدامت کا لباس پہنا دیتی ہے۔ اور اس کی انادیت میں کمی پیدا کر دیتی ہے۔ بلکہ بعض اوقات اس کی انادیت کو بالکل ختم کر دیتی ہے۔ اس لئے جو طریقہ بھی اختیار کیا جائے۔ اس پر مناسب وقتوں کے ساتھ دوبارہ غور و فکر کرنا لازم ہے۔ میری عرضداشت صرف تجدید فکر کی دعوت ہے نہ کہ تجدید طریق کی۔ اجتماعی نفسیت میں غور کرنے سے یہ حقیقت روشن ہو جاتی ہے۔ کہ جماعت جب کسی سوچے سمجھے ہوئے طریق پر عرصہ دراز تک عمل پیرا رہتی ہے۔ تو اس میں فکر کا عنصر کم ہو جاتا ہے۔ اور رسم و عادت کا عنصر بڑھ جاتا ہے افراد بھی اس قانون سے متاثر ہوتے ہیں۔ مگر جماعتوں میں اس کا اثر

جماعتوں کے تفرقے روزمرہ کا مشاہدہ ہے۔ اس کے علاوہ سب سے زیادہ مضمر چیز یہ ہے کہ مختلف جماعتوں اور افراد میں باہم تعاون بالکل مفقود ہے۔

ذہن افراد میں اختلاف خیالات ایک ناگزیر شے ہے لیکن ہر اختلاف کا انشقاق و تفرقہ تک پہنچ جانا اس بات کی دلیل ہے۔ کہ حدود و شناسی کا جو ہر امت میں نہیں باقی رہا ہے۔ پوری امت ایک جسم کی طرح ہے۔ کسی جسم کے ہر عضو کا الگ الگ ہو کر باہمی تعاون سے دست بردار ہو جانا اس کی ہلاکت کے مرادف ہے یا نہیں؟ حالت یہ ہے۔ کہ جو فرد یا گروہ جس طرز پر دینی خدمت انجام دے رہا ہے۔ صرف اسی کو حق سمجھتا ہے۔ اور اپنے علاوہ دوسرے خادمانِ دین کو جن کا طرز اس سے مختلف ہے۔ غلط راستہ پر سمجھتا ہے اور نہ صرف سمجھتا ہے بلکہ اس کی تبلیغ بھی کرتا ہے۔

جس طرح جسم انسانی میں مختلف اعضاء مختلف کام انجام دیتے ہیں اور ان میں سے ہر کام اپنی جگہ پر ضروری ہوتا ہے۔ اسی طرح امت مسلمہ کے جسم کو مختلف اعضاء اور مختلف خدمات کی حاجت ہے اور یہی نہیں بلکہ اس کی بھی شدید حاجت ہے کہ اس کثرت میں روح تعاون سرایت کر کے وحدت پیدا کر دے۔ یہی وحدت اسے کامیابی سے ہمکنار کر سکتی ہے۔ اسی چیز کا نام اجتماعیت ہے۔ لیکن یہ روح تعاون و اجتماعیت امت میں کہاں ہے۔ نہ ہم اختلافات کے حدود سمجھتے ہیں نہ باوجود اختلافات مشترک مقاصد کے لئے باہم تعاون کرنے کا سلیقہ رکھتے ہیں۔ ایسی صورت میں فرق کے متحدہ حملہ کا مقابلہ ہماری کامیابی پر کیسے ختم ہو سکتا ہے۔

فرد و جماعت کے ارتباط سے غفلت | اچھا اجتماع اچھے ہی افراد سے وجود میں آسکتا ہے۔ اور اچھے افراد اچھے ہی اجتماع میں پیدا

نہیں ہو سکتا ہے۔ ظاہر ہے کہ عالم کی تغیر پذیری کی پیاس محض رسم سے نہیں بجھائی جا سکتی۔ خصوصاً ایسے دین کے فروغ کے لئے محض رسمی طرز عمل کیسے کافی ہو سکتا ہے۔ جو قیامت تک پورے عالم انسانیت کی رہنمائی کرنے کے لئے آیا ہے۔ اس حقیقت کو سامنے رکھنے کے بعد تجدید فکر کی احتیاج اور زیادہ واضح ہو جاتی ہے۔ اس دعوتِ تجدید فکر کا مجھے حق ہے یا نہیں؟ دیندار طبقہ سے حسن ظن کی بنیاد پر مجھے یقین ہے۔ کہ وہ یہ حق تسلیم کرے گا۔ اس کے بعد اتمامِ سخن کی درخواست بے جا نہ ہوگی۔ ادبیات پوری کیسے ہو سکتی ہے۔ جب تک میں دیندار طبقہ کی ان کمزوریوں کی طرف اشارہ نہ کروں جو اس دعوت کی محرک اور موضوعِ فکر بننے کی طالب ہیں۔ مگر اس سے پہلے چند باتیں عرض کر دینا ضروری سمجھتا ہوں۔

(۱) خطاب عام دیندار طبقہ سے ہے یعنی ہر اس شخص سے جو دین کو دنیا پر ترجیح دیتا ہو۔ اور اس کے فروغ و غلبہ کا خواہشمند ہو۔ خواہ عالم ہو یا عامی۔ مخصوص طور پر علماء و دانشور ہی مخاطب نہیں ہیں۔

(۲) کسی فرد یا جماعت پر طعن و تخریبی ہرگز مقصود نہیں۔ جن افراد یا جماعتوں کو اپنے اندر ان کمزوریوں میں سے کوئی کمزوری محسوس ہو وہ اس کا ازالہ کریں۔ اگر نہ محسوس ہو تو اللہ تعالیٰ کا مشکور ادا کریں۔ اور آئندہ اس سے بچنے کی کوشش کریں۔ اظہارِ برائت بالکل غیر ضروری چیز ہے۔

(۳) جن غلطیوں کا میں تذکرہ کروں گا۔ ان کی کلیت کا مدعی نہیں ہوں مقصد عام حالت کا اظہار ہے۔ متشکینات کی تعداد بھی اچھی خاصی ہے۔

اجتماعیت کا فقدان | اسباب نامکامی میں سرفہرست جس چیز کا نام آنا چاہئے وہ قوم میں اجتماعیت کا فقدان ہے۔ دو صالحوں اور دیندار افراد اپنے اپنے مقام پر بہت اچھے خادمِ دین و ملت ثابت ہوتے ہیں۔ مگر جب ان دونوں کی اجتماعی قوت سے فائدہ اٹھانے کا قصد کیا جائے۔ تو بجائے مفید ہونے کے مضرت رسا بن جاتے ہیں۔

خوبی دہرائی کو فرد کی اچھائی برائی میں جو دخل ہے اُس سے غفلت برتی۔ ان حضرات کی توجہات اور کوششوں کا محور صرف انفرادی زندگی ہے۔ اجتماعی مسائل و حالات بالکل ان کے روضے سے غیر متعلق ہیں۔ یہ نظریہ غلط بھی ہے اور مضرت رسال بھی۔ افراد کے شخصی مزاج کے علاوہ اجتماع کا ایک مخصوص مزاج بھی ہوتا ہے۔ اُداس کا صالح یا فاسد ہونا افراد پر بہت قوی اثر ڈالتا ہے۔ اس کی قوت کا مقابلہ بسا اوقات بڑے بڑے اتقیا نہیں کر سکتے۔ بلکہ مقابلہ کرنے میں خود اپنے تقویٰ کا سرمایہ کھو بیٹھتے ہیں۔ ایک دو نہیں سینکڑوں مثالیں اسی قسم کی پیش کی جا سکتی ہیں کہ متقی افراد جب اجتماعات کے سنگلاخ میدان میں کامزن ہوئے تو رسوا درع و تقویٰ نے ان کا ساتھ چھوڑ دیا۔ یہی دیکھ لیجئے کہ آج اچھے خاصے اتقیا کی کجیا کر کے کسی اجتماع کو ترتیب دینے کی کوششیں اکثر و بیشتر ناکام یا بی پر ختم ہوتی ہیں بر فرد اپنی جگہ پر بہت صالح مگر اجتماع میں آتے ہی ان میں سے سب میں یا بعض میں ایسی چیزیں ابھرتی ہیں جو اجتماع کا مزاج فاسد کر دیتی ہے۔ انجام تفرقہ ہوتا ہے۔ یا اجتماعی تقویٰ کے فقدان کے ساتھ خود افراد کے صحیح مزاج کا فساد۔ وجہ یہی ہے کہ ان افراد کی اجتماعی زندگی بالکل غیر تربیت یافتہ ہوتی ہے۔ اجتماع کی اہمیت کو یہ لوگ نظر انداز کر دیتے ہیں۔ ہر موقع پر انفرادی نقطہ نظر سے کام لیتے ہیں۔ اور روح تعاون سے خالی ہوتے ہیں۔

انفرادیت پسند حضرات میں ایک جماعت انتہا پسندوں کی،

جن کے نزدیک اجتماعیات شجر ممنوعہ ہے۔ دین و بشریت صرف انسان کی انفرادی زندگی کے لئے ہے۔ اور سیاسی، معاشی و عہدہ زندگی کے اجتماعی شعبے دین سے خارج اور دنیا میں داخل ہیں۔ غیر اسلامی ممالک کو چھوڑیئے خود اسلامی ممالک کے متعلق بھی ان حضرات کا نظریہ

ہو سکتے ہیں۔ فرد و جماعت کا یہ باہمی ربط اکثر و بیشتر نظر انداز کر دیا جاتا ہے۔ بعض حضرات کا نظریہ یہ ہے کہ اجتماع اصل ہے۔ اس کی اصلاح اچھے افراد کو وجود میں لائے گی۔ اور بحیثیت مجموعی اُمت میں تقویٰ غالب آجائے گا۔ ان لوگوں نے فرد "بحیثیت فرد" کی اہمیت کو تو لا نہیں تو عملاً نظر انداز کر دیا ہے۔ اور ساری توجہات کا محور جماعت کو بنا دیا ہے۔ انفرادی اصلاح کے معنی سے نہ یہ حضرات خود واقف ہیں نہ اس کے ماہرین سے مشورہ لیتے ہیں۔ اس شدید غلطی کا اثر یہ ہے کہ انفرادی انفرادی کمزوریاں اجتماعی تقویٰ کے حماز کو بھی کمزور کر دیتی ہیں۔ اکثر تو یہ صحیح تفریق پر ختم ہوتی ہے۔ اور اگر جماعت قائم بھی ہے تو ضعف کی وجہ سے عموماً شکست نصیب ہوتی ہے۔ فتح ہوئی بھی تو وہ فیصلہ کن نہیں ہوتی۔ اور اس سے شکست کی تلافی کا ہونا بہت دشوار ہوتا ہے۔

ایک ماہر جرنل کی طرح شیطان ہماری اس کمزوری سے فائدہ اٹھانے میں پوری مستعدی و بیدار مغزی کا ثبوت دیتا ہے اس اجتماعی مقابلہ میں وہ کمزور افراد پر حملہ کرتا ہے۔ اور آہستہ آہستہ انہیں شکست دیتا ہے۔ اس طرح ایک پانچواں کالم وجود میں آجاتا ہے۔ جو غیر شعوری طور پر فتنی کی فتح اور تقویٰ کی شکست کے لئے کوشش کر رہا ہوتا ہے۔ ماضی اور حال دونوں میں دینداروں کی ایسی جماعتیں کثیر تعداد میں مل سکتی ہیں جو اشاعتِ تقویٰ کے لئے وجود میں آئیں۔ اور کچھ عرصہ کے بعد اس کے ارکان و اجزاء خود انہیں عیوب میں مبتلا ہوئے۔

اس گروہ کی غلطی یہ ہے کہ اس نے حقیقت کے صفا ایک جزو کو لیا۔ اسی طرح اس کے مقابلہ میں ایک دوسرا گروہ ہے۔ اس نے بھی حقیقت کے ایک جزو کو چھوڑ دیا۔ یعنی وہ اس کا تو قائل ہے کہ اچھے افراد سے اچھا اجتماع وجود میں آتا ہے۔ مگر خود اجتماع کی

موجودہ دور میں جبکہ مختلف اسباب نے اجتماعیات کو اس قدر غالب کر دیا ہے کہ گوشہ تنہائی کی جستجو عام باد گرد کی جستجو سے کم نہیں ہے صرف "خلوت در انجمن" کا طریقہ راہِ صواب ہے۔ اجتماعیات کو نظر انداز کرنا ایک لفظ بے معنی ہے۔ جب آپ ان سے ترکِ تعلق کرتے ہیں۔ تو اس وقت بھی آپ ان میں حصہ لیتے ہیں۔ لیکن اس قسم کا سبلی حصہ لینا بجائے مفید ہونے کے مضرت ثابت ہوتا ہے، مثلاً ممکن ہے کہ تنہا ایک شخص کے دوٹ نہ دینے کی وجہ سے ایک دیندار ناکام اور ایک فاسق یا بددین کامیاب ہو جائے۔ کیا ایسی صورت میں یہ دیندار اس ذمہ داری سے بری ہو سکتا ہے؟

خلاصہ یہ کہ صحیح راستہ یہ ہے کہ فرد و اجتماع دونوں کی جانب ساتھ ساتھ توجہ کی جائے۔ اور دونوں محاذوں پر ایک ساتھ فتنہ کا مقابلہ کیا جائے۔ یہ نظریہ کہ فرد کی اصلاح سے فراغت ہو تو اجتماع کی اصلاح کی طرف توجہ کی جائے یا اجتماع کی اصلاح ہو جائے تو افراد کو صلاح بنانے کی کوشش کی جائے نظری اعتبار سے خواہ کتنا ہی مدلل کیوں نہ ہو۔ عملی اعتبار سے بالکل ناکام ثابت ہو چکا ہے۔ دشمن کے داخلہ کے لئے قلعہ میں ایک رخنہ بھی غیر محفوظ چھوڑ دینا شکست کا پیش خیمہ ہے نہ کہ ایک پوری دیوار کو منہدم ہوتے دیکھنا اور اس کی حفاظت سے غفلت برتنا۔

ان دونوں محاذوں پر جنگ کرنے میں سب سے بڑی مشکل میرے نزدیک یہ ہے۔ کہ قوم میں ایسی جامع شخصیتوں کا تقریباً فقدان ہے جو دونوں کام انجام دینے کی صلاحیت رکھتے ہوں۔ لیکن بحمد اللہ ایسے اشخاص بکثرت موجود ہیں جو انفرادی زندگی میں تقویٰ کو رچا دینے کی خوب صلاحیت رکھتے ہیں۔ اسی طرح ایسے اشخاص بھی ابھی خاصی تعداد میں موجود ہیں جو اس صلاحیت سے محروم ہیں لیکن اجتماعی صلاح کام خوب انجام دے سکتے ہیں۔ اگر دونوں میں تعاون کا تعلق ہو جائے

یہ ہے۔ کہ خواہ زمام حکومت فاسقوں یا جسدوں بلکہ بددینوں اور گمراہوں مثلاً شیعوں، قادیانیوں وغیرہ میں سے کسی کے ہاتھ میں آجائے مگر دیندار اسی کا تقاضا یہ ہے۔ کہ اپنا مجرہ اور معمولی کام نہ چھوڑا جائے اور اصلاح حال کی کوئی کوشش نہ کی جائے۔ ان بددینوں کو صداقت یا وزارت کی کرسی سے اتار کر ان کی جگہ دینداروں کو بٹھانے کی کوشش کرنا دین کے حدود سے تجاوز اور بچی دنیا داری ہے۔ مسلمانوں کے معاشی مسائل کا کوئی حل تلاش کرنے کی کوشش تو کل کے خلاف اور حرام فاسقوں اور ناجردوں کے زیرِ اہتمام چلنے والے کالج اور اسکول مسلم نوجوانوں کی روحانی قتل گاہ، لیکن دینداروں کا خود انہیں قائم کرنا یا ان میں داخل ہو کر اصلاح کی کوشش کرنا دینداری کے خلاف، در نہ کم از کم فضول، اور اضاعتِ وقت، خلاصہ یہ کہ اجتماعیات وہ شجرہٴ ممنوعہ ہے جس کے قریب جانا بھی دینی مہبوط و زوال کا موجب ہے۔ اسلام صرف انفرادی زندگی تک محدود ہے۔ اجتماعیات کے متعلق وہ بالکل ساکت ہے۔ زندگی کے اس اہم اور عظیم حصہ پر اگر شیطان کا تسلط ہو جائے تو کوئی مضائقہ نہیں ہے۔

یہ اس نظریہ کا خلاصہ ہے جو صریح اسلامی تعلیمات کے خلاف ہمارے دیندار طبقہ کے ایک بہت بڑے حصے نے اختراع کر لیا ہے۔ اوپر یہ ہے کہ اجتماعی محاذ پر تقدس کی شکستِ کامل میں جس قدر اس نظریہ کو دخل ہے اتنا کسی دوسری چیز کو نہیں ہے۔ اگر امت میں اور کوئی کمزوری نہ بھی ہوتی تو یہ نظریہ ہی اسے تباہ کن شکست دلانے کے لئے کافی تھا۔

یہ طبقہ آج بھی اچھا خاصہ اثر رکھتا ہے۔ اسلامی ممالک میں اگر یہ طبقہ اپنے جردوں میں بیٹھا بیٹھا بھی اجتماعیات کے محاذ پر فتنہ کو شکست دینے کی کوشش کرے تو ان شاء اللہ قلیل ہی عرصہ میں ان ممالک کی کایا پلٹ جائے۔

نیز صحابہ کرام کے اجتماعی طریقہ عمل کو نوذہنہا کہ اس قسم کے اداروں کے حالات خدا ہر قسم سے دیکھے گا اُسے اس حقیقت کا اعتراف کرنا پڑے گا۔

اصلاح اجتماعیات میں ناکامی کی بہت بڑی وجہ یہی ہے کہ ہماری دینداری محض انفرادی ہے۔ اجتماعی زندگی میں تقویٰ سے ہم اسی طرح محروم ہیں جس طرح ہماری نصیحت کا ان پر اثر ہو تو کیسے ہو؟ اس کمزوری کا ایک اٹھ ہوا کہ عوام الناس دیندار طبقہ کا ہم اور وسیع تر اجتماعی معاملات میں قیادت و رہنمائی کا اہل نہیں سمجھتے خصوصاً سیاسی قیادت اور دینداری میں تو بالکل منافات سمجھتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ فاسق سیاسی قائدین سے نالائی سمجھنے کے باوجود ان کے مقابلہ میں ان کی رہنمائی کو ترجیح دیتے ہیں۔ بلکہ بہت سے کم فہم تو سیاست نام ہی جھوٹ و فریب، دھوکہ بازی اور ابن الوقتی کار کھتے ہیں۔ اور اس کا اہل ان ہی لوگوں کو سمجھتے ہیں جن میں یہ اوصاف زیادہ پائے جائیں۔

کسی دینی خدمت کے لئے تعاون و اجتماع کے طریق اجتماع

(۱) انجمن سازی۔ یہ طریقہ زمانہ کے جمہوری مزاج سے مناسبت رکھتا ہے۔ یہ اس کی خوبی ہے مگر دیکھا جاتا ہے۔ کہ کچھ عرصہ کے بعد اس میں عہدوں کے لئے کشمکش ہونے لگتی ہے۔ اور پارٹی بندیاں شروع ہو جاتی ہیں نتیجہ مناج کی کمی بلکہ بعض مضرتوں کی صورت میں نمایاں ہوتا ہے۔ سبب وہی اجتماعی تقویٰ کا فقدان ہے۔

دوسری خاص شخصیت کی دینی عظمت دیندار کارکنوں کو اس کے گرد جمع کر دیتی ہے۔ اس کی دو شکلیں ہوتی ہیں الف۔ روحانی تعلق اور عقیدت اس حاشیہ نشینی کی تحریک کے جیسے مرید اپنے شیخ کے گرد جمع ہو جاتے ہیں۔

تو مسئلہ سہولت سے حل ہو سکتا ہے۔ افسوس ہے کہ اجتماعیت کے فقدان نے اس تعاون کو خواب خیال بنا دیا ہے۔ اگر طوالت کا خوف نہ ہوتا ہو۔ تو واقعات کی روشنی میں اس حقیقت کو دکھانا کہ امت کے زمانہ عروج میں یہ تعاون کس قدر زیادہ ادنیٰ کی حدہ شکل میں پایا جاتا تھا۔

یہ واقعہ بالکل روشن ہے کہ اجتماعی تقویٰ کا فقدان دینداری کی سب سے بڑی شکست

اجتماعیات میں ہوئی ہے۔ فہرست اسباب میں ایک شے کا اور اضافہ کیجئے۔ یعنی خود دینداروں میں اجتماعی تقویٰ کا فقدان، استثنائاً کا چھوٹا سا حاشیہ نکال دینے کے بعد یہ کہیں کچھ مشکل نہیں۔ کہ ہم اپنی انفرادی زندگی میں دینداری و تقویٰ کے باوجود جب اجتماعیات میں داخل ہوتے ہیں تو "جامہ تقویٰ" اتار کر الگ رکھ دیتے ہیں۔ عارف شیرازی کو تو ان وعظوں سے شکایت تھی جو محراب منبر پر جلوہ کرتے ہیں۔ مگر "خدمت" میں پہنچ کر "کار دیگہ" میں مصروف ہوتے ہیں۔ مگر میری شکایت اس کے برعکس ہے۔ زمانہ کے انقلاب نے بکثرت اشخاص کے "ہلوسے" کو "خلوت" کے ساتھ مخصوص کر دیا ہے۔ اور جب وہ میدان اجتماعیت میں آتے ہیں تو وہ دنیا داروں کی طرح "کار دیگہ" میں مشغول ہو جاتے ہیں۔ ان کو صرف داعیوں سے شکوہ ہے۔ اور مجھے عام دینداروں سے جن میں وہ بھی داخل ہیں۔ یقین نہ ہو تو ان اجتماعی اداروں کو دیکھ لیجئے جو دیندار افراد کے ہاتھ میں ہیں۔

مدارس، مکاتب، اسکول، کالج، انجمنیں ہر جگہ آپ دیکھیں گے۔ کہ دیندار اور تعبد گزدار حضرات بھی انہیں اصولی کار پر عمل پیرا ہیں جو اپنے دنیا داروں اور فاسق و فجار کے رہنما ہیں۔ یہ حقیقت بہت تلخ ہے جس کا حل سے تارنا بہت دشوار ہے لیکن جو شخص بھی عقیدت و محبت کے جذبات ایک طرف رکھ کر ادارت نبوی صلی اللہ علیہ وسلم

قابل قبول عقیدت کا صرف وہ درجہ ہے۔ جو خود ان کے دل میں ہوتا ہے۔ اور اس حد تک جتنا ہر ایک کے بس کی بات نہیں۔ اس لئے کہ اس کا عنوان عصمت و مافوق الفطرت مقرر کرنا لغوی حیثیت سے ان کے مافی الضمیر کی صحیح تعبیر ہوتی ہے۔ اگرچہ وہ ان الفاظ کا اعلان کرتے ہوئے جھگٹتے ہیں۔

قوم کا اجتماعی زوال بڑی بڑی شخصیتوں کو اپنی جگہ سے ہٹا دیتا ہے۔ آج دنیا کے اسلام کی مرکزی شخصیتوں کو دیکھو ان میں سے بھگت باد، محمد دیندار، تقویٰ اور خلمس کے خوشامد پسندی کے مرض میں گرفتار نہیں کی۔ یہاں تک کہ خاندان میں بھی اس سے محفوظ نہیں رہیں۔ حالانکہ ان کی وضع ہی اصلاح اخلاق کے لئے ہوتی ہے۔ یہ عادت جاشیہ نشینوں اور توسلین میں سے ایک حلقہ مقررین وجود میں لاتی ہے۔ اور یہ لوگ مرکزی شخصیت پر اس طرح حاد دل ہو جاتے ہیں کہ اپنی مقصد بآریا کے لئے اسے جس طرح چاہتے ہیں اہمال کرتے ہیں۔ یہ چیز بھی اخلاقیات کی وصت کے لئے ایک آئینہ دیو رہن جاتی ہے۔ اصول ختم ہو جاتے ہیں شخصیت سمٹ رہ جاتی ہے۔ کام کے بجائے تقرب کی کوشش اصل قرار پاتی ہے۔ اور اصل کام ٹھکڑ کر رہ جاتا ہے۔

میں نے خدمت ملت کے دونوں مردہ طریقوں کے غیر ہنر واضح کر دیئے۔ اب غالباً ناظرین کی نئے طریق کار کے متعلق سُننے کے منتظر ہوں گے۔ لیکن میں نے نہ تو کوئی نیا راستہ دریافت کیا ہے۔ اور نہ کسی نئے راستے کی طرف دعوت دینا اس وقت مناسب سمجھتا ہوں۔ صحیح صورت یہ ہے۔ کہ ان ہی دونوں طریقوں کی اصلاح کر کے ان کی افادیت میں اضافہ کیا جائے۔ موصوفہ مذکور طریقہ کے بارے میں دو باتیں اور سُن لیجئے۔

وہ شخصیتیں جن کی صلاحیتیں ان میں قوتِ جاذبہ پیدا کر دیتی ہیں اگر اس قوت کے خسران کرنے میں کفایتِ شعاری سے کام لیں۔ تو

(وہ) نگرانیِ بلندی اور قیادت کی قابلیت اس عقیدت کا باعث ہو جیسے بعض سیاسی یا معاشرتی رہنماؤں کا حلقہ اثر قائم ہو جاتا ہے۔

ان دونوں صورتوں میں اس طریق اجتماع کی امتیازی خوبی یہ ہے کہ اسی میں قوتِ جامعہ بہت قوی ہوتی ہے۔ اسی طرح کارکنوں کی قوتِ کارآمدگی بھی اس میں تنقید کرتی ہے۔ عہدوں کی کشمکش کی نحوست بھی یہاں نہیں ہوتی۔ یہ سب اس طریق کی خوبیاں ہیں۔ مگر اس کی کمزوریوں کی طرف سے چشم پوشی بھی ایک طرح کی نا انصافی ہے۔ اس کی پہلی کمزوری تو یہ ہے کہ موجودہ زمانے کے جھڑی مزاج سے مناسب مصلحت نہیں رکھتا۔ اس لئے اس کا پیمانہ محدود ہوتا ہے۔ صرف وہ اشخاص اس سلسلہ میں منسلک ہونے کے لئے تیار ہوتے ہیں جو مرکزی شخصیت سے بہت زیادہ متاثر ہوتے ہیں۔ (یہ کوئی قاعدہ کلیہ نہیں ہے اس کے بالکل برعکس اس نوع کے بعض ایسے اجتماع بھی دکھائی دیتے ہیں جن کا حلقہ اثر بہت وسیع ہے۔ دکھانا درحقیقت یہ ہے۔ کہ اس طرز اجتماع کی ساخت میں فی نفسہ وہ چمک نہیں ہوتی جو اسے دور تک پھیلنے دے۔ یہ دوسری بات ہے کہ کسی خاص شخصیت کی قوتِ دعوت یا حالات کی سازگاری اسے وسیع کر دے۔ اور ظاہر ہے کہ ایسی شخصیتیں بہت کم ہوتی ہیں)

عمر کی کوتاہی بھی اس طریق کی ایک کمزوری ہے۔ مرکزی شخصیت کے خاتمہ کے ساتھ حرکت بھی عموماً ختم ہو جاتی ہے۔ اس طرز خدمت کی ایک اور کمزوری کی طرف توجہ دلانا بھی ضروری سمجھتا ہوں۔ جس نے اس کی افادیت کو محدود کر رکھا ہے۔ دیکھا یہ جاتا ہے۔ کہ اس حلقہ عقیدہ مند کے افراد باہر کے لوگوں کو کام سے زیادہ مرکزی شخصیت کی طرف دعوت دیتے ہیں۔ اگر کوئی شخص محض اصولی اتفاق کی بنا پر اشتراکِ عمل کرتا چکا، مگر مرکزی شخصیت کا عقیدت مند نہ ہو تو اس کے لئے ان حضرات سے نباہ کرنا مشکل ہوتا ہے۔ اور بالآخر وہ اس حلقہ سے باہر نکل جانے پر مجبور ہو جاتا ہے۔ جزئی تعاون یا جزئی عقیدت بھی ان لوگوں کے نزدیک کافی نہیں ہوتی

ان کی افادیت کئی گنی زیادہ ہو سکتی ہے۔ اپنے خدمات کا محور ایک محدود اور چھوٹے حلقہ کو بنالینا محدود زمین میں زیادہ محنت کر کے کاشت کر لے۔ اچھی پیداوار کی توقع اسی صورت میں کی جاسکتی ہے نہ اس دورہ کی قوتِ جاذبہ رکھے والی شخصیتیں بھی بکثرت ہوتی ہیں۔ اندسانی سے تیار بھی کی جاسکتی ہیں۔ اگر چھوٹے چھوٹے حلقوں میں یہ قوتیں صرف کی جائیں اور ان میں آپس میں تعاون ہو تو انشاء اللہ حالات بہت تیزی سے تبدیل ہوں گے۔

لیکن یہ ایک بڑا منہ ہے کہ ہمارے اندر جب کوئی شخصیت ابھرتی ہے۔ اور خدمتِ دین و ملت کا بیڑا اٹھاتی ہے۔ تو اس کا عقاب بہت کم از کم پورے ایک ملک کو اپنی شکار گاہ بنانا چاہتا ہے۔ جس کے پر پرواز یا دری نہیں کرتے۔ وہ تھک کر یا بیٹھتا ہے۔ کہ کبھی اٹھنے کا نام نہیں لیتا۔ اور جیسے مقبولیت کی قلیلِ فضا بھی مل جاتی ہے۔ وہ بڑی آزمائش میں پڑ جاتا ہے۔ حُبِ جاہ، حُبِ شہرت، عجب و پندار اس کی متاعِ اخلاص پر ڈاکہ ڈالتے ہیں۔ بہت کم ایسے ہوتے ہیں۔ جو اس حملہ سے اس متاعِ بے بہا کو بچا سکیں۔ اخلاص باقی بھی رہا تو قوتِ تاثیر اس وسیع فضا میں پہل کر گمزدہ ہو جاتی ہے اور کچھ عرصہ کے بعد اسے خود احساس ہوتا ہے۔ کہ اس کی باتیں فضا میں گم ہو جاتی ہیں یا صرف کانوں تک پہنچ کر اور دل میں اترنے کی راہ نہ پا کر زباؤں کے راستہ تحسین و آفرین یا تنقید و تبصرے کی صورت میں واپس آ جاتی ہیں۔ افادیت کی کمی اور مقصد میں ناکامی دونوں صورتوں میں لازم ہیں۔ یہ عام حالت ہے۔ مخصوص اور نادر حالات و اشخاص سے یہاں بحث نہیں۔ اگر خوفِ طالت نہ ہوتا تو اسلام کے واقعات کو شہادت میں پیش کر کے دکھاتا کہ انہوں نے قوت کی اس کفایتِ شکاری، اور حلقہ خدمت کی اس تحدید کو کس طرح ملحوظ رکھا۔ اور اس سے کس قدر عظیم الشان فائدہ پہنچایا۔ اس وقت ہمارے اندر بڑے قایدین

کی کمی نہیں ہے۔ قلتِ درحقیقت چھوٹے قایدین کی ہے۔ اور یہی اُمت کی تعمیر میں مبنی و کام دیتے ہیں۔

اس سلسلہ کی دوسری بات یہ ہے کہ ہر زمانہ کا ایک خاص مزاج ہوتا ہے جس کی رعایتِ شریعتِ اسلامیہ نے بھی کی ہے اور یہ اسی ابدی شریعت کی خصوصیت ہے کہ اس نے قیامت تک ہر زمانہ کے مخصوص مزاج کا لحاظ رکھا ہے۔ مؤخر الذکر طریقہ عموماً مرکزی شخصیت کی آمرانہ مطلق العنانی پر مبنی ہوتا ہے۔ لیکن اس جوہری دور میں سمجھ دار لوگوں میں ایسے اشخاص بہت کم ہوں گے جو اسے برداشت کر سکیں۔ ایسی اطاعت صرف غیر معمولی عقیدت رکھنے والے ہی کر سکتے ہیں۔ مولوی متعقدین بھی اس زمانہ میں اس حد تک جانے پر تیار نہیں ہوتے۔ اگر یہ حضرات اپنے رویہ میں ذرا اعتدال پیدا کریں اور کم از کم فرعی مجتہد فیہ مسائل میں اختلاف رائے کو برداشت کر لیا کریں اور سنتِ شوریٰ کو زندہ کریں تو اس کی افادیت کا دائرہ بہت وسیع ہو جائے۔ گویا اس سے زیرِ بحث دونوں طریقوں کا ایک مرکب تیار ہو جائے گا۔ جو دونوں کے فوائد کا جامع ہو گا۔ افسوس کہ ساتھ کہنا پڑتا ہے کہ بقول ایک بزرگ کے بہت سے ایسے مسلمان حکمران جنہیں ہم ظالم و جاہل کہتے ہیں جس قدر شدید اختلاف و تنقید کو برداشت کر لیتے تھے آج بہت سے مبطلین اصلاح بلکہ خافقہ نشین حضرات بھی اس سے خفیف تر اختلاف و تنقید کو نہیں برداشت کر سکتے۔

اختلافِ طرق کی قدر | اگر ڈروں افراد پر مشتمل اُمت،

پوری زندگی پر چھایا ہوا دین، مختلف جہات سے فتنے کا حملہ، ان سب باتوں کو پیش نظر رکھ کر غور کیجئے تو خدامِ دین کے طرزِ خدمات و خدمات کا اختلاف بالکل طبعی اور مناسب نظر آئے گا۔ کسی شخصیت یا جماعت کا یہ دعویٰ کہ جو خدمت وہ انجام دے رہی ہے۔ یا جس

طرز پر وہ اور بے دلی علیٰ ہذا کسی دین پر حاد رکھتے ہیں اور وہ سب غمی ہے۔ ان ہے۔ جیسے دین باہمی تعاون افتراق کا سب اپنی جگہ بجلے اضافہ فرد ہو یا جماعہ شدہ عائد کی جائے۔ ا۔ جلدی رکھتے جائے۔ اگر ہے۔ جسے نا جاسکتا ہے چاہئے۔ فحشا دوسرے کے کام لیں تو ہم یہ خواہش فی مستحقین کی

کا مصداق بنادیتی ہے۔ حقوں کے مٹنی دل کا مقابلہ اس قدر طویل
محاذ پر ایک ہی فوج کیسے کر سکتی ہے؟ اور ایک ہی سالار ان سب
کی قیادت کا فرض کیسے انجام دے سکتا ہے؟ خصوصاً جب جنگ میں
مختلف اقسام کے تدابیر اور متنوع سامان حرب استعمال ہو رہا ہو۔ اور
ہر محاذ ماہرین خصوصی کا طلب گار ہو۔ خدمات کے ساتھ فطری صلاحیتوں
اور خود خدمات میں باہم مناسبتوں کے اخلاف، نیز اصول کفایت قوت
پر بھی نظر کیجیے۔ تو تقسیم کار کے ساتھ جزئی تعاون ہی ایک ایسا راستہ
دکھائی دیتا ہے جو منزل مقصود تک پہنچا سکتا ہے۔

مداخت کے بجائے حملہ | "فست" کے مقابلہ میں "تقویٰ"

بھی بہت اہمیت رکھتا ہے۔ کہ دیندار طبقہ کی کوششوں کا خاص مقصد
اکثر مداخت ہوتا ہے۔ تاہم خود ہوش دہے کہ وہ فوج کبھی کامیاب نہیں
ہو سکتی جس کا ہتھلے نظر محض مداخت اور بچاؤ ہو۔ غیر اسلامی ممالک میں
تو اقدام کی راہ میں بہت سے موانع ہیں۔ لیکن اسلامی ممالک میں یہ کام
اس قدر مشکل نہیں۔ اسلام تو دنیا کی ہر قوت کو رضائے الہی کے لئے
استعمال کرنے کا مطالبہ کرتا ہے۔ ان عظیم الشان قوتوں کو فاسقوں کے
ہاتھوں میں چھوڑ دینے کے کیا سنی؟ وقت کا تقاضا ہے کہ دیندار ان
سب قوتوں کو بقدر امکان اپنے ہاتھ میں لینے کی کوشش کریں۔ جو دین
کے فروغ میں معاون ہو سکتی ہیں۔ بشرطیکہ ان کے استعمال میں کوئی شرعی
مانع نہ ہو۔ اس سلسلہ میں سب سے پہلے تعلیمی نظام پر نظر پڑتی ہے۔ اگر
دیندار طبقہ اس میں ذخیل ہو جائے تو نتائج بہت ہی قابل قدر ہوں گے
اگر دینی اصول پر علوم جدیدہ کے مستقل ادارے (اسکول۔ کالج وغیرہ)
قائم کئے جائیں جو کلیہ دینداروں کے قبضہ میں ہوں تو نور علی نور کا
مصداق ہے۔ اسلامی حکومتوں کی انتظامی، دفاعی، تعلیمی اور مختلف
شعبوں کی اعلیٰ خدمت کے لئے دیندار اور قابل امید وارتیار کرنا اور

طرز پر وہ خدمت دین کر رہی ہے صرف دہی صحیح ہے۔ ایک غلط
اور بے دلیل دعویٰ ہے جس کی تائید نہ عقل کر سکتی ہے نہ نقل۔
علیٰ ہذا کسی فرد یا جماع کا یہ دعویٰ کہ اس کے خدمات کا دائرہ پورے
دین پر عادی ہے۔ اور دوسرے اشخاص کی خدمات جزئی حیثیت
رکھتے ہیں اسی طرح غلط اور حدود سے تجاوز ہے۔ اپنی خدمت کو اہم
اور دوسرے کی خدمت کو غیر اہم اور حقیر سمجھنا بھی اسی قسم کی غلط
فہمی ہے۔ ان غلطیوں کا سبب درحقیقت "تفرد" کا شوق افراد ہوتا
ہے۔ جسے دینی محرک نہیں کہا جاسکتا۔ اس قسم کے دعادی اور خیالات
باجی تعاون اور اجتماعیت کے دشمن اور خادمان دین کے درمیان
افترق کا بیج بوئے دالے ہیں۔ دین کی جتنی خدمات ہو رہی ہیں۔ وہ
سب اپنی جگہ ضروری اور مفید ہیں۔ ان کے اقسام و انواع میں کمی کے
بجائے اضافہ کی کنجائش اور حاجت ہے۔ ہر خادم دین کا (خواہ وہ
فرد ہو یا جماعت) اصول یہ ہونا چاہئے۔ کہ جو خدمت اور طرز خدمت
شدائد و جوازیں داخل ہے اس کی ہمت افزائی اور قدر
کی جائے۔ اس سے جزئی تعاون کیا جائے۔ اور اپنی خدمت کو
جاری رکھتے ہوئے جتنی اعانت و امداد ممکن ہے۔ اس سے دریغ نہ کیا
جائے۔ اگر خود اپنے اپنے وفاء کے اندر کوئی ایسا نقص موجود
ہے۔ جسے مذکورہ بالا شخص (یا جماعت) کی امداد سے دور کیا
جاسکتا ہے۔ تو استقامت کی راہ میں وقار و پندار کو نہ حائل ہونا
چاہئے۔ مختلف خدام دین اگر اس اصول پر عمل پیرا ہوں اور ایک
دوسرے کے تقاضوں و مشکلات کو دور کرنے میں باہمی تعاون سے
کام لیں تو انشاء اللہ ہر محاذ پر "تقویٰ" کو تقویت حاصل ہوگی۔

ہمہ گیری کی خواہش بھی اس جزئی تعاون سے مانع ہوتی ہے
یہ خواہش فی نفسہ کیسے ہی اخلاص پر کیوں نہ مبنی ہوں اور کتنی ہی
محسن کیوں نہ کہی جائے۔ مگر کامیابی کو برات عاشقان بڑا آہو

بہی
ب
ہے
تیک
و
س
کے جو
کھنے
نک
ال
شت
بردا
ادارہ
ایک
س کے
سلمان
مید کو
ناہ
شت
بردا
نت
ان سب
ن د
صیت
س

لیکن یہ غلطی قابلِ عفو ہے۔ اس لئے مجھے اُمید ہے کہ ہمارا دیندار طبقہ میرے ان مروضات پر غور کرے گا۔ میری گزارش صرف اتنی ہے کہ ان مروضات کو مخلصانہ اور نیر خواہانہ سمجھ کر ان پر غور ضرور فرمایا جائے۔ عمل تو پھر بھی اپنے اختیار ہی میں ہے گا۔ مسئلہ بہت اہم ہے۔ سوال اُمت کی موت و زیت کا ہے۔ اس کا شدید تقاضا ہے کہ شکر کے ادلیں موت کو بھی نہ ضائع کیا جائے۔ فقط و ما اريد الا اصلاح ما استطعت وما توفيقى
اللا بيا لله۔

ابنیں ان سروسوں کے امتحانات میں کامیاب بنانے کی کوشش کرنا بھی بہت مفید اور ضروری خدمت ہے۔ اسی طرح عوام کی قیادت اور سیاسی خدمات کے لئے متقی اور فہیم اشخاص کی تربیت اپنی افادیت و حاجت کے لئے مخلوج بیان نہیں۔ اگر دیندار طبقہ "فسق" کے خلاف یہ حملہ آور نہ پوزیشن اختیار کرے اور با مصطلح حیات ابتداء اپنے ہاتھ میں لینے کی کوشش کرے تو جنگ کا پانسہ پلٹ سکتا ہے۔ اور فسق و فجور کو پساٹی و شکست کا مزہ چکھایا جاسکتا ہے۔ ہو سکتا ہے کہ کمزوریوں کی تشخیص میں مجھ سے غلطی ہوئی ہو

مجلس حزب الانصار بھیرہ کا سالانہ جلسہ

مجلس مرکزیہ حزب الانصار جامع مسجد بھیرہ کا اٹھاسیواں سالانہ تبلیغی جلسہ ۱۲-۱۵-۱۶ مارچ ۱۹۵۵ء کو جامع مسجد میں منعقد ہوگا جس میں پاکستان کے ممتاز علمائے کرام مشائخ عظام اور رہنمایان قوم شرکت فرمائیں گے اور مسلمانوں کو اپنے مواعظ حسنہ اور ارشادات سے مستفید فرمائیں گے۔ حزب ستور سابق بریٹی حضرت کے قیام طعام کی کفالت مجلس کے ذمہ ہوگی۔ اس عظیم اجتماع میں دارالعلوم عزیزہ جامع مسجد بھیرہ کے طلبہ عربی زبان میں تقاریر کریں گے اور مقالات پڑھیں گے۔ شائقین مندرجہ بالا تاریخیں یاد رکھیں اور اس مبارک اجتماع میں شریک ہو کر ثواب دارین حاصل کریں۔
المعلن۔ صاحبزادہ انوار احمد گوبی ناظم شعبہ نشر و اشاعت مجلس حزب الانصار جامع مسجد بھیرہ

انسانیت کی سب سے اہم ضرورت

===== (مولانا سید ابوالحسن علی ندوی) =====

مرکز اصلاح و تبلیغ کے زیر اہتمام ۲۱ فروری ۱۹۵۶ء کو میونسپل پارک لال باغ کھنڈ میں ایک جلسہ عام منعقد ہوا تھا۔ جس میں غیر مسلم بھی موجود تھے۔ اس جلسہ میں مولانا سید ابوالحسن علی صاحب ندوی نے مندرجہ ذیل تقریر فرمائی۔

(اداسرہ)

بہچانے اور اپنی منزل مقصود تک پہنچنے کے لئے بھی اللہ تعالیٰ نے کوئی انتظام فرمایا یا نہیں۔ زندگی کے اس سب سے اہم شعبے اور سب سے زیادہ ضروری کام کے لئے بھی کوئی سلسلہ یا کردہ دنیا میں جاری رہا یا نہیں جو اپنے اس مقدس کام کو اپنی زندگی کا مقصد سمجھے اور اس اہم خدمت کے لئے اپنی جان کی بازی لگائے۔

دوستو! انسان کی جو اصل ضرورت ہے۔ اس کے لئے کوئی انتظام نہ کرنا اللہ کی رحمت سے بعید ہے۔ اس دنیا میں حکمت و صلاحیت اور ہر شعبہ زندگی سے مناسبت سب کچھ موجود ہے جس کی بڑی دھوم دھام ہے۔ انسانوں کے معمولی ذہن بھی اسے ماننے کے لئے تیار نہیں کہ انسانوں کی اصل ضرورت اور حقیقی مقصد (کہ کس طرح زندگی گزارنا چاہئے۔ کس طرح وہ اپنے پالنے والے کو راضی کر سکتا ہے) کا کوئی انتظام نہ کیا گیا ہو۔ خدا نے انسانوں کی اس اہم ضرورت اور خدمت کے لئے دنیا میں ایک ایسی بے غرض جماعت بھی پیدا کی جو انسانوں کو بتلاتی ہے کہ یہ زندگی تمہاری تابعدار ہے۔ لیکن تم کسی اور کے تابعدار ہو۔ اور انسانی زندگی حیوانیت سے بہت ممتاز اور ایک بڑے منصب کی مالک ہے۔ دنیا میں گاڑیاں چلانے اور معمولی معمولی سفروں کے لئے طرح طرح کے انتظامات موجود ہیں لیکن

دوستو اور بزرگو! اللہ تعالیٰ نے انسان کو دنیا میں زندگی گزارنے کے لئے پیدا کیا۔ اور اس کی ضروریات کو اس دنیا میں بڑی فیاضی، فراوانی اور افراط کے ساتھ پیدا فرمایا۔ انسان کی ضروریات کیا ہیں اور ان کا سامان کس طرح کیا گیا ہے۔ یہ ہم اور آپ سب جانتے ہیں۔ جن لوگوں نے ذرا بھی اس دنیا پر غور کیا ہے۔ وہ جانتے ہیں کہ جن چیزوں کی انسان کو سیکڑوں اور ہزاروں برس کے بعد ضرورت پیش آئی ان کا اہتمام دنیا کی ابتداء کے ساتھ کر دیا گیا تھا۔ انسانی ضروریات کے ہر شعبہ کو چلانے اور ترقی دینے کی صلاحیت اور محبت بھی انسان کی فطرت میں ودیعت کی۔ اور اس کے لئے ایسے کردہ اور افراد پیدا کئے جو اپنے اُن شعبوں اور پیشوں کو اپنی اولاد سے بھی زیادہ عزیز رکھتے ہیں۔ حالانکہ ان میں سے بعض ایسے کام ہیں۔ جن سے ہمیں وحشت ہوتی ہے لیکن اُن کے کرنے والے ان پیشوں کو اپنے سینے سے لگائے ہوئے ہیں اور اسی میں دُنیا کے نظام کو چلانے اور ترقی دینے کا راز ہے۔ اسی لئے دُنیا میں ہزاروں انقلابات کے باوجود ہر پیشہ اور ہر شعبہ موجود اور ترقی یافتہ ہے۔

انسان کے سوچنے کی بات یہ ہے۔ کہ اس زندگی کو اپنے پیدا کرنے والے کے منشاء کے مطابق گزارنے، انسان کے مقصد کو

جینا شکاری عقابوں اور درندوں کی طرح دوسروں کو چھاڑ رکھنا نہ ہو بلکہ وہ اپنی زندگی سے انسانوں کو انسانیت کا مقام اور اصل مقصد حیات یاد دلائیں۔ اور ان کی حقیقت بتلائیں کہ وہ دنیا میں خدا کے نائب اور اس دنیا کے امین و متولی ہیں۔ اور تمہارے لئے اٹھنے جو مقدر کیا ہے اس کی دستیں اس محدود دنیا سے بالاتر ہیں۔

سرگرمہ انبیاء حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم جس زمانے میں مبعوث ہوئے اس وقت دنیا میں سب کچھ تھا۔ ملک تھے، قومیں تھیں، حکومتیں تھیں، لیکن کوئی ایک جماعت ایسی نہ تھی کہ اپنی ذات اور اولاد کے علاوہ انسانیت کی فکر مند ہو۔ انسان بھیڑیوں کی خصلت اختیار کر چکا تھا جس کا کام اپنے بچوں کو پالنا اور دوسروں کو چھاڑنا تھا۔ کڑوروں انسانوں میں کوئی ایک آدمی ایسا نہ تھا جو دنیا کی اس نازک گھڑی کو محسوس کرتا، اسی لئے لوگوں کو آپ کے مقصد کو سمجھنے میں بڑی دقت اور کشمکش ہوئی کیونکہ اس وقت انسانیت دنیا کی ایک منڈی بنی ہوئی تھی۔ ایک دوسرے کو اپنا کام سمجھتا تھا۔ انسانیت کی روح لرز رہی تھی۔ بڑے بڑے فلسفی شاعر اور حکماء اس اضطراب سے نا آشنا اور خطرے سے ناواقف تھے۔

حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم نے دنیا کی اس ذہنیت کو بدلنے کے لئے ایسا ہی جماعت بنائی جس نے ایمان یقین، عمل اور دعوت کے مجموعہ کی قوت سے اس بات کا فیصلہ کیا کہ انسانیت کو ہلاکت اور تباہی کے سمندر میں ڈوبنے سے بچائیں گے۔ آپ نے ایسے بے لوث اور جانناز گردہ کی تشکیل کی جو اس خطرے میں انسانیت کی کمزور لیں اور زندگی کے دھاکے کا رخ موڑ دیں۔ اور دنیا کو چیلنج کریں اور زندگی کی پٹری پر اپنے آپ کو ڈال دیں۔ کہ اب اس لائن پر نہیں چلنے دیں گے۔ یہ وہ اُمت ہے جس نے اللہ کی طرف بلائے اور ہدایت کا راستہ دکھانے کو اپنی زندگی کا مقصد قرار دیا۔ حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم نے اس نازک وقت میں دنیا کی بڑی سے بڑی عزت، لذت اور بالاتر کی شیکشون کو ٹھکرا کر اپنے فیصلے سے انسانیت کے مستقبل کو روشن اور دنیا کی زندگی کو

میں پڑھتا ہوں کہ زندگی کا سفر بھی کوئی اہمیت رکھتا ہے یا نہیں؟ میں اس کے ماننے کے لئے تیار نہیں کہ زندگی کا اتنا بڑا سفر بغیر کسی ادارے اور جماعت کے طے ہو سکتا ہے۔ جس میں طرح طرح کے خطرات، تضاد، تقابلیں اور کشمکش موجود ہو جس کو پورا کرنے کی ایسی حالت ہے کہ نہ ہم ہیں نہ ہماری خواہشات۔ آپ سانپوں اور بچھوؤں کو جانتے ہیں۔ لیکن ان کی زندگی میں جو سانپ اور بچھو، جو شے اور کانٹے اور جراثیم ہیں وہ زندگی کے سفر کے لئے بڑے خطرناک ہیں۔ اور اللہ تعالیٰ نے انسانوں پر اپنی خاص رحمت اور فضل سے ان خطرات سے بچنے کا انتظام فرمایا۔ ہر زمانے میں وہ اپنے برگزیدہ بندے بھیجے جو انسانوں کو ان کے مالک سے متعارف کرائیں اور ان کی اصل فلاح اور حقیقی بہبود کا راستہ دکھائیں۔ مگر یہ انتظام نہ ہوتا تو انسانیت اور حیوانیت میں کوئی فرق نہ ہوتا۔ مگر اللہ کو یہ دنیا چلانی اور انسانی زندگی کو اپنے معیار پر لانا تھا۔ جس کے لئے اس نے ایسے انسان پیدا کئے جو اس خدمت کو انجام دیں اور ان کو ایسا غلوں اور ایسی لگن عطا کی کہ وہ انسانوں کی ہدایت اور فلاح کے لئے اپنی ہر عزیز چیز قربان کرتے رہے۔ اور لوگوں کو ان پر شبہ نہ ہوتا تھا کہ نہ معلوم دنیا سے یہ کیا حاصل کرنا چاہتے ہیں۔

اللہ تعالیٰ نے ان برگزیدہ بندوں میں سے سب سے آخری پیغمبر حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو پیدا کیا۔ اور آپ نے ایک جماعت تیار کی جس کی بنیاد معاشرت، تمدن اور کلچر پر نہیں تھی۔ اور جس کا دائرہ کسی قوم، گردہ یا ملک تک محدود نہ تھا۔ بلکہ اس نے انسانیت کے سارے عالم کو اپنا پیغام دیا اور فرمایا کہ میرے پاس وہ لوگ آئیں جو زندگی میں ہوس کے مقابلے میں قناعت اور خود غرضی کے بجائے بے نفسی، اور نفس پرستی کے بجائے خدا پرستی کو ترجیح دیں۔ جن کا مقصد حیات دنیا میں حشرات الارض کی طرح